نوجوانوں سے خطاب، مرتبہ جناب اسد اللہ خانصاحب علیگ، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۰۳ مجلد، قیمت ؏ پتہ: اسد اللہ خاں ہومیو پیتھ اکبر پور [illegible]

زیر نظر کتاب میں جوانوں کے لئے طبی ہدایتیں تحریر کی گئی ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ سن بلوغ کے بعد ماں باپ بننے تک کی زندگی میں انکا کیا طور طریقہ ہونا چاہئے، پہلے اس زمانہ کی زندگی کو خراب اثرات اور برے معمول سے بچانے کا ذکر ہے، پھر مختلف حیثیتوں سے شادی کی ضرورت، اسکی عمر کی تعیین، تجدید و افزائش نسل، حمل، زچگی، بچوں کی پرورش و رضاعت کے طریقے اور ان کو بیماریوں سے بچانے کی صورتیں بیان کی گئی ہیں، مصنف خود ہومیو پیتھ ڈاکٹر ہیں، اسلئے ان کے اکثر مشورے مفید ہیں، لیکن ان کی بعض باتوں میں تضاد ہے، جیسے ایک جگہ مردوں کی شادی کے لئے مناسب عمر چالیس سال اور عورتوں کے لئے ۲۵ سال تحریر کی ہے، مگر دوسری جگہوں پر اس سے مختلف باتیں لکھی ہیں، عمر کی تعیین کے لئے طبی، اقتصادی اور معاشرتی حیثیت سے جو دلیلیں بیان کی ہیں وہ ممکن ہے صحیح ہوں، مگر قرآن مجید سے استدلال مضحکہ خیز ہے، اسی طرح ایک جگہ ضبط تولید کی حمایت اور دوسری جگہ اسکی تردید اور افزائش نسل کے سلسلہ کی حدیثیں درج کی گئی ہیں، مثلاً صفحہ ۲۲ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ہدایت بزرگان دین کی طرف منسوب کر دی گئی ہے،

اعجاز تسکین، از جناب منظور تسکین صاحب متوسط تقطیع کاغذ کتابت، طباعت عمدہ صفحات ۱۴۴ مجلد مع خوبصورت گرد پوش قیمت لو عیے، پتہ: مہارج اسٹور گھگول بازار، ڈاکخانہ گھگول، پٹنہ،

یہ جناب منظور الحق تسکین صاحب کا پہلا مجموعہ کلام ہے، ان کو تغزل سے زیادہ مناسبت ہے، اس مجموعہ کا زیادہ حصہ غزلیات ہی پر مشتمل ہے، آخر میں چند نظمیں، قطعات اور رباعیات بھی درج ہیں، مصنف کو تغزل کی قدیم روایات اور قدریں عزیز ہیں، تاہم اس پرانی زمین میں بھی کہیں نئے نئے گل بوٹے نظر آتے ہیں، نظموں اور قطعات میں موجودہ حالات کی عکاسی زیادہ کی گئی ہے، مجموعی حیثیت سے تسکین صاحب کے کلام میں لطافت بھی ہے، اور جوش بیان بھی،

"ض"

جلد ۱۱۷ ماہ مارچ سنہ ۱۹۷۶ء مطابق ماہ ربیع الاول سنہ ۱۳۹۶ھ عدد ۳

مضامین

......٭٭٭......

شذرات

۲۲، ۲۳ فروری ۱۹۷۶ء کو دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ تھا، لکھنؤ سے مولانا عبدالماجد دریابادی (صدر مجلس عاملہ) اور مولانا ابوالحسن علی ندوی، بھوپال سے مولانا حافظ عمران خاں ندوی، دہلی سے جناب سعید انصاری صاحب تشریف لائے، اور دوسرے ارکین مقامی تھے، بمبئی اور علی گڈھ سے بھی ارکین آنے والے تھے، مگر بعض وجوہ سے نہ آسکے۔

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی وفات کے بعد دارالمصنفین کا جو نیا نظام قائم ہوا ہے اس میں جناب مولانا ابوالحسن علی ندوی اس کے سرپرست اعلیٰ ہو کر اسکے اصلی روح رواں بن گئے ہیں، ان ہی کی ہدایت سے اب اس کے تمام امور انجام پاتے ہیں، انھوں نے اسکی بہت سی ذمہ داریاں بھی قبول کر لی ہیں، اسکی علمی سرگرمیوں کے لیے بہت سے ایسے نئے عنوانات اور موضوعات کا انتخاب کیا ہے جو زمانہ کے ذوق اور اقتضا کے مطابق ہو، اسی لیے انھوں نے جلسہ میں نئے رفقاء کے اضافہ پر زور دیا، ابتک یہاں کے رفقاء خدمت اور ایثار کے جذبے سے کام کرتے رہے ہیں، مگر موجودہ گرانی میں محض اس جذبہ کا سہارا لینا دشوار طلب امر ہو گیا ہے، اس لیے مولانا ابوالحسن علی کے اصرار سے یہاں کے خدمت گزاروں کے وظائف میں اضافہ کی بھی تجویز منظور ہو گئی ہے، وہ خود اہم سے اہم کام محض رحمت ایزدی اور اپنی جوان ہمتی اور بلند حوصلگی سے انجام دیتے رہتے ہیں، اسی کی تلقین دارالمصنفین کے خادموں کو کرتے رہتے ہیں، انکے ساتھ ان کے ہمنوا ارکین کا یہ خیال ہے کہ اخراجات بڑھیں گے تو اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے اس کی آمدنی کا بھی سامان ہو جائے گا۔

دارالمصنفین ابتک اس اصول پر کاربند رہا کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلایا جائے، لیکن اب اسکے ارکین پاؤں کے لحاظ سے چادر کے خواہاں ہیں، اسکی پرانی نسل کے بعد نئی نسل کو تیار کرنے کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی ہے، مگر یہ اسی وقت تیار ہو گی جب وہ اپنے کو مالی حیثیت سے مطمئن پائیگی، ان کو مطمئن کرنے میں اخراجات بڑھیں گے، مگر بڑھتے ہوئے اخراجات کے ساتھ اسکی آمدنی بھی بڑھنی چاہئے، مگر یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب اسکی مطبوعات کی خریداری میں بھی اضافہ ہوتا رہے، ہندوستان کا اردو داں طبقہ کتابیں تو پڑھنا چاہتا ہے، مگر خرید کر پڑھنے والے کم ہیں، اس لیے

شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمائش ہے

انقرہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر شوکت بولو نے دارالمصنفین آکر چند دنوں قیام کیا، وہ سرسید احمد خاں اور علامہ شبلیؒ کے موازنہ کے عنوان سے ایک کتاب قلمبند کر رہے ہیں، اسکے مواد کی فراہمی میں دہلی، علی گڑھ اور لکھنؤ ہوتے ہوئے اعظم گڈھ بھی پہنچے، وہ علامہ شبلی کی تحریروں کے بڑے مداح ہیں، ان کی بہت سی تصانیف خریدیں، یہاں کے قیام میں ان کو نماز کا پابند دیکھا، ان سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ ترکی میں مسجدیں آباد رہتی ہیں اور وہاں دینی مدارس بھی بکثرت ہیں، جنکے مصارف حکومت پورے کرتی ہے، انھوں نے یقین دلایا کہ انکے یہاں اسلام اور دینداری اور اسلامی ممالک سے کم نہیں، خدا کرے وہاں اسلام کی مشعل اسی طرح روشن رہے جس کے لیے وہ ماضی میں مشہور رہا، اور جس کی وجہ سے دنیا کے سارے مسلمان اس سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے،

گذشتہ ماہ بمبئی یونیورسٹی کی طرف سے پی، ایچ، ڈی کے ایک مقالہ کے ممتحن کی حیثیت سے بلایا گیا، جس کا عنوان دارالمصنفین کی ادبی خدمات تھا، مقالہ نگار خورشید احمد نعمانی وہاں کے مہارشٹی دیانند کالج میں اردو کے لکچرار ہیں، اس کالج کے اردو پڑھنے والے طلبہ کو مخاطب کرنے کا بھی موقع ملا، اسکے پرنسپل صاحب

ے اخلاق، تواضع اور خاکساری سے متاثر ہوا، وہاں ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کے اساتذہ مزید تربیت کے لیے آئے ہوئے تھے، انکے سامنے ایک تقریر کرتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ اس دور کی تاریخ پڑھاتے وقت دلوں کو جوڑیں نہ کہ توڑیں، بمبئی کے ایک سیاسی جلسہ میں بھی شریک ہونے کا اتفاق ہوا، وہاں کے وزیر اعلیٰ کی اردو میں تقریر پر دہلی اور لکھنؤ والوں کو رشک آسکتا تھا، انجمن اسلام کے ریسرچ شعبہ کو دیکھکر طبیعت خوش ہوئی، اسکا کتب خانہ بڑھتا جارہا ہے، آجکل جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب انجمن اسلام کے سکریٹری ہیں، وہ اپنی خوش سلیقگی کیلئے پورے بمبئی میں مشہور ہیں، انجمن کے ہال میں بمبئی کی انجمن ترقی اردو کی دعوت پر "دبستان شبلی" کے موضوع پر ایک تقریر کرنی پڑی، جناب ظ، انصاری نے اپنی تعارفی تقریر میں دار المصنفین کی خدمات کو پورے طور پر سراہا، مشہور شاعر جناب سکندر علی وجد صاحب نے اس جلسہ کی صدارت کی جس میں بمبئی کے اہل علم کا بڑا منتخب مجمع تھا، اسلیے اس موقع پر بولنے میں انشراح پیدا ہوا۔

ڈاکٹر عبد العلیم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور صدر اردو بورڈ دہلی کی اچانک وفات سے پورے علمی حلقہ کو دکھ ہے، ان کے خیالات کچھ بھی رہے ہوں، لیکن وہ اپنی شرافت طبع اور مرنجاں مرنج رہنے کی وجہ سے ہر حلقہ میں پسند کیے جاتے تھے، جہاں رہے ان کا وزن اور وقار رہا، دار المصنفین سے انکے تعلقات برابر خوشگوار رہے، مسلم یونیورسٹی کے عربی اور اسلامیات کے شعبوں کو ترقی دینے میں بھی انکی خدمات یادگار رہینگی، وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بہت ہی نازک دور میں بنائے گئے، ان پر نظر انتخاب ڈاکٹر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کی پڑی تھی، جو ان کو بہت محبوب رکھتے تھے، انھوں نے جامعہ ملیہ میں تعلیم پائی، ان کی وفات سے جامعہ ملیہ ایک لائق فرزند، علمی حلقہ ایک شریف اہل علم اور ملک ایک بہت ہی باوقار محب وطن سے محروم ہوگیا، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے، آمین۔

مقالات

اقبال:- اسلام اور اشتراکیت

از جناب جگن ناتھ آزاد صاحب کشمیر

(۲)

اقبال کی زندگی کا بیشتر حصہ ایک ایسے دور میں گذرا جب کہ یورپی ممالک میں استحصال کے طریقے اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے، اقبال کے سامنے اشتراکی اور قومی تحریکیں آگے بڑھیں، وہ ایک دردمند دل لے کر آئے تھے، انھیں سرمایہ داری اور جاگیرداری کی یہ ادا ایک آنکھ نہ بھاتی تھی کہ وہ تمام روحانی اقدار کو بالائے طاق رکھ کر عوام کی لوٹ کھسوٹ میں مصروف رہیں، یہ تو حالات کی ستم ظریفی تھی کہ مسلم لیگ سے تعلق کی بنا پر اقبال کو ہندوستان میں انھی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے سمجھوتہ کرنا پڑا جن کے طور طریقوں سے انھیں نفرت رہی، وہ جب دنیا کی منڈی میں انسان اور اس کی روح کو بھیڑ بکری کی طرح بکتا دیکھتے تھے تو انھیں ایک دلی کرب ہوتا تھا اور یہ کرب ان کی شاعری میں قدم قدم پر نظر آتا ہے، محاورہ ما بین حکیم فرنسوی اگسٹس کومٹ و مرد مزدور" بھی اسی درد و کرب کا ایک مظہر ہے، جس میں حکیم فرنسوی مزدور سے کہتا ہے کہ بنی آدم ایک دوسرے

کے اعضاء ہیں، اور ایک ہی درخت کے برگ و بار ہیں، فطرت نے ان تمام اعضاء کے لئے اپنے فرائض مقرر کر رکھے ہیں، مثلاً دماغ کا کام فکر سے کام لینا ہے، اور پاؤں کا کام زمین پر چلنا ہے، ایک کا کام حکم دینا اور دوسرے کا حکم کی تعمیل کرنا ہے، محمود محمود ہے ایاز ایاز، کیا تو نہیں دیکھ رہا ہے کہ اسی تقسیم سے زندگی کا خارزار چمن بنا ہوا ہے؟ حکیم فرنوی کا مقصد یہ ہے کہ اعضاء کی طرح انسانی طبقوں میں تقسیم کار کا اصول کارفرما ہے، اور اسی اصول کے تحت سرمایہ دار سرمایہ دار ہے، مزدور مزدور، اور اسی تقسیم کار ہی سے زندگی میں حسن ہے، لیکن مزدور اس فلسفے کے فریب میں نہیں آنا چاہتا، اور صاف لفظوں میں حکیم فرنوی سے کہتا ہے،

فریبی بہ حکمت مرا اے حکیم — کہ نتواں شکست ایں طلسم قدیم

مس خام را از زر اندودہٗ — مرا خوے تسلیم فرمودہٗ

کند بجرہ آنبایم اسیر — زخارا بریتشہ ام جوے شیر

حق کوہکن دادی اے نکتہ سنج — بہ پرویز پر کار نابردہ رنج

خطا را بہ حکمت مگرداں صواب — خضر را نگیری بدام سراب

بدوشِ زمیں بار سرمایہ دار — ندارد گذشت از خور و خواب کار

جہاں راست بہروزی از دستِ مزد — ندانی کہ ایں ہیچ کارست دزد

پے جرم او پوزش آوردہٗ

بایں عقل و دانش فسوں خوردہٗ

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اقبال سرمایہ داری کے خلاف مزدور کی بغاوت سے تو خوش تھے، لیکن اشتراکی نظام حکومت پر ان کا قطعی ایمان نہیں

تھا، اقبال کے جن اشعار یا نظموں کو لے کر انھیں یا ان کی روح کو اشتراکی کے لقب سے نوازا جا رہا ہے، وہ نظمیں ایک تو اس جذبۂ بغاوت کا نتیجہ ہیں جو اقبال کے دل میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف سلگ رہا تھا، دوسرا افسانوی رنگ کا، اقبال چونکہ عملی طور پر سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے اور ملکی سیاست میں انھیں انھی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ساتھ قدم بہ قدم چلنا تھا، اس لئے ان کی شاعری میں یہ دبی ہوئی آگ اور تیزی سے بھڑکی ہے، اور کہیں انھوں نے یہ تلخ رنگ اختیار کیا ہے،

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی — مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

اور کہیں "قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" کا طنزیہ انداز اپنایا ہے جس میں سرمایہ داری کی کہانی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے، جب کہ وہ صرف زمین کو اپنی ملکیت بناتا ہے، اور زمین سے لے کے آسمان تک ساری کائنات مزدور کو بخش دیتا ہے،

غوغائے کارخانۂ آہنگری ز من — گلبانگ ارغنون کلیسا از آنِ تو

نخلے کہ شہ خراج بر و می نہد ز من — باغ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو

تلخابہ کہ دردِ سر آرد از آنِ من — صہبائے پاک آدم و حوا از آنِ تو

مرغابی و تدرو و کبوتر از آنِ من — ظل ہما و شہپر عنقا از آنِ تو

ایں خاک و آنچہ در شکم او از آنِ من

وز خاک تا بہ عرشِ معلا از آنِ تو

یہاں اشتراکیت کے موضوع پر اقبال کی ایک اور نظم "نوائے مزدور" کا ذکر بہت ضروری ہے، یہ نظم علامہ نے اسی زمانے (یعنی ۱۹۲۲ء) میں کہی، جب کہ انھوں نے خضر راہ کہی تھی، اس لئے صرف یہی نہیں کہ دونوں نظموں میں ایک سی امنگ اور حوصلہ مندی نظر آتی ہے، بلکہ اکثر مصرعوں کے مضمون بھی قریب قریب یکساں ہیں، خضر راہ اور نوائے مزدور ایسی نظمیں پڑھنے کے بعد اگر کوئی اقبال کو اشتراکی سمجھ بیٹھے تو یہ پڑھنے والے کی خطا نہیں، بلکہ اس کا سبب کلام اقبال کی سحر انگیزی اور اثر آفرینی ہے،

ز مزدِ بندۂ کرپاس پوش و محنت کش — نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر[1]

ز خوی فشانیِ من لعلِ خاتمِ والی — ز اشکِ کودکِ من گوہرِ ستامِ امیر

ز خونِ من چو زلو فربہی کلیسا را — بزورِ بازوے من دستِ سلطنت ہمہ گیر

خرابہ رشکِ گلستاں ز گریۂ سحرم

شبابِ لالہ و گل از طراوتِ جگرم

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز[2] — مے کہ شیشہ گداز د بہ ساغر اندازیم

مغان و دیرِ مغاں را نظامِ تازہ دہیم[3] — بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم

ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم — بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

بہ طوفِ شمع چو پروانہ زیستن تا کے[4]

ز خویشتن ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

---

[1] اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

[2] آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا — آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۹ پر)

ورنہ اقبال کس حد تک اشتراکیت کو ایک مکمل یا جائز ضابطۂ حیات سمجھتے تھے اس کا اندازہ اس قسم کے اشعار سے ہو سکتا ہے،

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا — طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اور جہاں تک اشتراکی انقلاب کا تعلق ہے وہ اس اشتراکی انقلاب کو جس نے ایک جہانِ کہنہ کو ختم کر دیا ہے، ضمیر کی موت سے تعبیر کرتے ہیں،

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و سازِ حیات — خودی کی موت ہے یہ، اور وہ ضمیر کی موت

دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا — قریب آ گئی شاید جہانِ پیر کی موت

اس سلسلے میں اقبال کی نظم "موسیو لینن و قیصر ولیم" اشتراکیت کے بارے میں اقبال کے نظریے پر مکمل روشنی ڈالتی ہے، اس نظم میں اقبال قیصر ولیم کی زبانی یہ کہلواتے ہیں کہ کہ غلامی انسان کی فطرت میں شامل ہے جیسے برہمن کی فطرت میں بتوں کے طواف کا جذبہ، موسیو لینن اس بات کا دعویٰ کرتا ہے،

غلامِ گرسنہ دیدی کہ بردرید آخر — قمیصِ خواجہ کہ رنگیں ز خونِ ما بود است

شرارِ آتشِ جمہور کہنہ ساماں سوخت — ردائے پیرِ کلیسا قبائے سلطاں سوخت

قیصر ولیم اسے جواب دیتے ہیں،

اگر تاجِ کئی جمہور پوشد — ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست

ہوس اندر دلِ آدم نہ میرد — ہماں آتش میانِ مرزغن ہست

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۸)

[3] اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

[4] کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو — اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

عروجِ اقتدارِ سحر فن را — ہماں پیچاکِ زلفِ پرشکن ہست

نماند نازِ شیریں بے خریدار

اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اقبال کو مارکسزم یا نئے روس میں جو خوبیاں نظر آئیں وہ یہ ہیں کہ یہ نظام ملوکیت[1] اور سرمایہ داری کا دشمن ہے، اور اس میں محنت کش طبقے کے لئے مواقع موجود ہیں ورنہ مارکس کی جدلیاتی مادیت سے اقبال کو شدید اختلاف ہے، اقبال مارکسزم کی جگہ ایک ایسا نظام چاہتے ہیں، جس میں ملوکیت، سرمایہ داری، اور طبقہ داری کش مکش تو اسی طرح ناپید ہوں جس طرح مارکسزم میں ناپید ہیں، لیکن اس کی بنیاد روحانیت پر ہو مادیت پر نہ ہو، اور ایسا نظام اقبال کو صرف اسلام ہی میں نظر آتا ہے، چنانچہ ایک نظم "اشتراکیت" میں اس نظریئے کو وہ بڑے صاف لفظوں میں بیان کرتے ہیں،

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار

اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور — فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

انساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار[2]

---

[1] عرب خود را بہ نورِ مصطفےٰ سوخت — چراغِ مردۂ مشرق بر افروخت

ولیکن آں خلافت راہ گم کرد — کہ اول مومناں را شاہی آموخت

خلافت بر مقامِ ما گواہی است — حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است

ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ — خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

(ارمغانِ حجاز)

[2] اسرار سے مراد یہ نظریہ ہے کہ پیداوار کا انحصار سرمائے پر نہیں بلکہ محنت پر ہے۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں — اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرفِ قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک — اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

اس کا احساس ہے کہ یہ بحث خاصی طویل ہو رہی ہے اور اپنے اس نظریہ کی وضاحت میں کہ اقبال کو اسلامی اشتراکی کہنا اقبال، اسلام اور اشتراکیت تینوں کے ساتھ بے انصافی کرنے کے مترادف ہے، میں نے ضرورت سے زیادہ اقتباسات پیش کر دیئے ہیں، لیکن اس کا سبب صرف یہی ہے کہ کہنے کو تو جواہر لال نہرو نے بھی کہہ دیا کہ اقبال عمر کے آخری حصے میں زیادہ سے زیادہ سوشلزم کے قریب آ گئے، آل احمد سرور اور عزیز احمد نے بھی انھیں مسلم سوشلسٹ لکھ دیا، سردار جعفری نے بھی لکھ رکھا ہے کہ انھوں نے ۱۹۳۷ء میں علی گڑھ میں اشتراکیت کے حق میں کچھ کہا تھا اور ڈاکٹر تاثیر نے بھی کہہ دیا ہے کہ انھوں نے کئی موقعوں پر کھلے لفظوں میں یہ کہا تھا کہ "اگر مجھے کسی مسلم ملک کا ڈکٹیٹر بنا دیا جائے تو پہلا کام جو میں کروں گا یہ ہوگا کہ اس ملک کو سوشلسٹ ملک بنا دوں گا، لیکن اس دعویٰ کی تائید نہ اقبال کی نظم سے ہوتی ہے نہ ان کی نثر سے[1]، ضرب کلیم اور

---

[1] ایڈورڈ تھامسن، جواہر لال نہرو اور کانٹ ویل اسمتھ نے تو یہاں تک لکھدیا ہے کہ اقبال عمر کے آخری حصے میں مطالبۂ پاکستان کے حامی نہیں رہ گئے تھے، میں یہاں اس موضوع کو زیر بحث نہیں لاؤں گا اگرچہ اس کا اقبال اور اشتراکیت کے ساتھ گہرا تعلق ہے، کیونکہ اگر اقبال واقعی اشتراکی بن چکے تھے تو ان کا مطالبہ پاکستان سے دست بردار ہونا لازمی تھا، لیکن اقبال کی کوئی تحریر (نظم یا نثر) نہ تو ان کے اشتراکی ہونے کی شہادت دیتی ہے، نہ اس بات کی کہ وہ مطالبہ پاکستان سے دست بردار ہو گئے تھے ہو سکتا ہے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس مسئلے پر کھل کے بحث کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہماری نئی نسل اقبال کے بارے میں کم از کم اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو کہ اقبال نے اپنے دور کی اہم ہستیوں سے کیا کچھ کہا اور اپنی کتابوں میں کیا کچھ اور

"ارمغانِ حجاز" ان کی آخری کتابیں ہیں، ان میں کہیں تو ایسی بات نظر آجاتی جس سے آج کا قاری یہ اندازہ لگا سکتا کہ زندگی کے کسی دور میں اقبال اپنے پرانے خیالات سے تائب ہوگئے تھے، کیا ہم "کارل مارکس کی آواز" سے یہ اندازہ لگانے میں حق بجانب ہیں کہ اقبال سوشلسٹ بن چکے تھے، جس میں اقبال کہتے ہیں،

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دنیا کو اب گوارا پرانے افکار کی نمائش
تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوطِ خمدار کی نمائش مریز و کجدار کی نمائش
جہانِ مغرب کے بتکدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیار کی نمائش

یا مندرجۂ ذیل شعر سے ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ اقبال نے اسلام اور اشتراکیت کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیا تھا؟

یہ وحیِ دہریت روس پہ ہوئی نازل کہ توڑ ڈال کلیساؤں کے لات و منات

ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے تو اس سلسلے میں خاصا خلط مبحث سے کام لیا ہے، لکھتے ہیں کہ پیامِ مشرق میں اقبال لینن کو قیصر ولیم کی پست سطح پر لے آئے ہیں، اور بالِ جبریل میں انھوں نے لینن کو ایک سنت کے روپ میں پیش کیا ہے[1]، ڈاکٹر تاثیر مرحوم

---

[1] کانٹ ویل اسمتھ نے اپنی کتاب "ہندوستان اور پاکستان میں جدید اسلام" میں ڈاکٹر تاثیر کا یہ فقرہ نقل کیا ہے، لیکن اپنی طرف سے اس میں لفظ جہنم "کا اضافہ کر دیا ہے، اور فقرہ یوں مکمل کیا ہے کہ اقبال لینن کو جہنم میں قیصر کی سطح پر لے آئے ہیں، معلوم نہیں (بقیہ حاشیہ ص۱۷۳ پر)

کا اشارہ پہلی مثال میں نظم موسوم بہ "مسولینی و قیصر ولیم" کی طرف ہے، اور دوسری مثال میں نظم موسوم بہ "لینن خدا کے حضور میں" کی طرف، اول تو پہلی نظم سے یہ اندازہ لگانا کہ قیصر ولیم کو اقبال نے کسی پست سطح پر رکھا ہے، خواہ مخواہ کی کھینچا تانی ہے، اس نظم میں اقبال نے نہ تو قیصر ولیم کو کسی پست سطح پر دکھایا ہے، اور نہ لینن کو، قیصر ولیم اور لینن پہلی جنگ عظیم کے دو کردار ہیں، ایک کے لئے جنگ زوال کا اور دوسرے کے لئے عروج کا باعث بنی، قیصر ولیم اس نظم میں لینن سے یہ کہتا ہے کہ "یہ فرض کرنا کہ اشتراکی دور میں عوام غلامی سے آزاد ہوگئے ہیں غلط ہے، در اصل وہ پہلے زار روس کے غلام تھے، اب اشتراکیت کے غلام ہیں"۔ اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ یہ اقبال کا اپنا نظریہ ہے، اور انھوں نے اشتراکیت پر طنز کرنے کے لئے ایک شاعرانہ اندازِ بیان اختیار کیا ہے تو کیا اس طنز کی نشتریت اس نظم میں آکر کم ہو جاتی ہے، جس میں بقول ڈاکٹر تاثیر اقبال نے لینن کو ایک سنت کے روپ میں پیش کیا ہے؟ اشتراکی نظامِ حکومت پر اس سے بڑا طنز اور کیا ہو سکتا ہے کہ لینن خدا کے حضور میں پیش ہو اور وہاں یہ کہے،

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات — حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پایندہ تری ذات
محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے — بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم — حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

بقیہ حاشیہ ص۱۷۲) اسمتھ نے یہ لفظ جہنم کہاں سے شامل کیا ہے، کیونکہ یہ لفظ نہ تو کہیں اقبال کی مذکورہ نظم میں آیا ہے، نہ ڈاکٹر تاثیر کی مذکورہ تحریر میں،

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات[1]

یہ توفیق نہ ہوا تو [illegible] کی طرح کا کوئی سادہ حصہ ہوا،

یہاں علامہ اقبال کا ایک خط جو انھوں نے مسٹر جناح کو ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو لکھا نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جو دولت کی غیر مساوی تقسیم کے متعلق اُن کے خیالات پر خاصی روشنی ڈالتا ہے، اسے اب چاہے کوئی اشتراکیت سمجھے، یا اشتمالیت لیکن خط کے الفاظ یہ ہیں:

"روٹی کا مسئلہ روز بروز زیادہ اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے اور مسلمان یہ

---

[1] ڈاکٹر تاثیر نے اپنی اس تحریر میں اس غلط بحث کو اور بھی آگے بڑھایا ہے، اور یہ کہنے کے بعد کہ اقبال کے نزدیک ایک سوشلسٹ ملک خودی کی نشو و نما کے لئے بہتر مواقع پیدا کر سکتا ہے، انھوں نے اقبال کو سامراج، سرمایہ داری اور ہر قسم کے ذرائع استحصال کا دشمن ظاہر کیا ہے، یہاں تک تو خیریت صحیح ہے، لیکن اس کے بعد ڈاکٹر تاثیر لکھتے ہیں کہ خودی پر اس قدر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بعض دفعہ "شیطان" اور اس کے زندہ نمونوں (مسولینی وغیرہ) کی بھی تعریف کر دیا کرتے تھے،

جہاں تک ابلیس کے جذبۂ بغاوت کا تعلق ہے، اقبال نے اسے یقیناً سراہا ہے، اور یہ اقبال کی شاعری کا ایک بہت ہی نمایاں پہلو ہے "میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح" اور "رجیم" کا "فرد طاغوت خواہ مخواہ" اس کی روشن مثالیں ہیں، لیکن یہ کہنا کہ اقبال شیطان کے زندہ نمونوں مثلاً مسولینی وغیرہ کی تعریف کر دیا کرتے تھے، فکر اقبال کے بے احتیاط مطالعہ کا نتیجہ ہے، اقبال نے مسولینی پر دو نظمیں کہی ہیں، ایک "بال جبریل" میں ہے، دوسری "ضرب کلیم" میں (یہاں میں ان نظموں کی بات نہیں کر رہا ہوں جن میں محض مسولینی کا ذکر موجود ہو) (بقیہ حاشیہ صفحہ

محسوس کرنے لگا ہے کہ وہ گذشتہ دو سو برس سے بتدریج نیچے گرتا چلا جا رہا ہے، مسلمان کے خیال میں اس کا افلاس ہندو ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کی کوششوں کا نتیجہ ہے، یہ پہلو ابھی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہے کہ اس افلاس کی ایک بہت بڑی وجہ بدیشی حکومت بھی ہے، تاہم زود یا بدیر اس حقیقت کا احساس اسے ہو کر رہے گا، جہاں تک جواہر لال کے اس سوشلزم کا تعلق ہے، جس کی بنیاد دہریت پر ہے، مسلمان اس کی طرف چنداں توجہ نہیں کریں گے، اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ پھر مسلمانوں کا افلاس دور کرنے کی اور تدبیر کیا ہو سکتی ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۴) متعلقہ ابی سینیا (۱۰ اگست ۱۹۳۵ء)

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش

ع ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش
یا
کون بحر روم کی موجوں سے ہے لپٹا ہوا

ع گاہ بالد چوں صنوبر گاہ نالد چوں رباب

بال جبریل والی نظم اس وقت کہی گئی جب مسولینی اپنی جہد و عمل سے اٹلی کا ڈکٹیٹر بنا، اس وقت تک اس کا کوئی شیطانی روپ دنیا پر ظاہر نہیں ہوا تھا، اس کا شیطانی روپ دنیا پر اس وقت ظاہر ہوا جب اس نے ابی سینیا پر حملہ کیا، اس وقت اقبال نے مسولینی کے پردے میں اس ساری غارت گری اور آدم کشی کو اپنا ہدف بنایا، جو مغربی اقوام کا شیوہ رہا ہے، مسولینی نے جب ابی سینیا پر حملہ کیا تو لیگ آف نیشن نے اٹلی پر اقتصادی پابندیاں لگانے کا فیصلہ کیا جس کے جواب میں مسولینی خداوندانِ لیگ سے کہتا ہے

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج

یاد رکھیے! مسلم لیگ کے سارے مستقبل کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ لیگ
اس سوال کا کوئی تسلی بخش حل تلاش کرلے، اگر لیگ ایسا کوئی حل تلاش کرنے
میں کامیاب نہ ہوئی تو مسلمان عوام حسب سابق لیگ سے بے تعلق اور غافل رہیں گے۔"

۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو اقبال نے مسٹر جناح کے نام مسئلہ فلسطین کے بارے میں جو خط
لکھا اس کا متن یہ ہے:-

"مسئلہ فلسطین نے مسلمانوں کو سخت پریشان کر رکھا ہے .... ذاتی طور
پر میں ایک ایسے مسئلے کی خاطر جس کا تعلق اسلام اور ہندوستان کے ساتھ ہے،
جیل جانے کو تیار ہوں، مشرق کے دروازے پر مغربی استعمار کے اس اڈے کی
تعمیر اسلام اور ہندوستان دونوں کے لئے خطرے کا باعث ہے۔"

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی اپنی کتاب "اقبال کے آخری دو سال" میں لکھتے ہیں:
"جب ۲۶ جنوری ۱۹۳۸ء کو ہائی کورٹ کے فل بنچ نے مسجد شہید گنج کی اپیل
خارج کر دی تو مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا تھا اور بڑے بڑے احتجاجی
جلوس نکلنا شروع ہو گئے تھے، اسی شام غلام رسول خاں نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت
میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اب کیا کرنا چاہئے تو ڈاکٹر صاحب رو پڑے اور کہنے لگے
مجھ سے کیا پوچھتے ہو، میری چارپائی کو اپنے کندھوں پر اٹھاؤ اور اس طرف

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۵)

آں سبزہ جب نے کی آبیاری میں لہو	اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام	تم نے لوٹی کشت دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج
پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی	کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

لے چلو جدھر مسلمان جا رہے ہیں۔ اگر گولی چلی تو میں بھی ان کے ساتھ مروں گا۔"

آخر الذکر خط اور بیان کا تعلق اقبال کے نظریۂ اشتراکیت کے ساتھ تو نہیں ہے،
لیکن ان سے یہ تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ آخر دم تک اقبال اپنے ہی نظریے کے مطابق مسلمانوں
کے مفاد کے بارے میں سوچتے رہے، خواہ وہ ان کا معاشی مسئلہ ہو، خواہ مذہبی۔ یہاں
میرا اعتراض اس بات پر نہیں کہ اقبال ایسا کیوں سوچتے رہے، بلکہ میرا اعتراض اقبال
کے ان ناقدین پر ہے جو اقبال کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

اقبال کے پیش نظر اگر معاشی عمرانی اور مذہبی مسائل رہے ہیں، اور ان کا حل
انھوں نے اشتراکی نظام سے باہر ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے تو اس سے ان کی
شاعرانہ یا مفکرانہ عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا اور نہ ہی ہم سردار جعفری کے
ہم خیال ہو کر اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ اقبال شاعر بڑے ہیں اور فلسفی چھوٹے۔ اقبال
شاعر تو یقیناً بہت بڑے ہیں اتنے بڑے کہ آج تک اردو کا کوئی شاعر ان کی بلندی تک
نہیں پہنچ سکا، لیکن اقبال مفکر بھی چھوٹے نہیں ہیں، ان کا اپنا ایک انداز فکر ہے،
یہ الگ بات ہے کہ ہمارے بعض نقاد اس اندازِ فکر سے متفق نہیں ہیں، لیکن ایک
سوال یہ بھی ہے کہ ان کی نثری تصانیف پر جن میں انھوں نے وضاحت سے اپنا
نظام فکر پیش کیا ہے، کھل کر بحث ہوئی بھی کہاں ہے۔

اقبال نے اگر مشرقی اور مغربی مفکرین کے خیالات کو اپنایا ہے، تو اسی حد تک
جس حد تک وہ انھیں قابل قبول تھے، اس حد کے بعد انھوں نے اپنا راستہ الگ
اختیار کیا، مغربی خیالات کو جانچنا اور پرکھنا اور انھیں اپنانا یا رد کرنا کسی بھی ماہر فن
کی عظمت کی دلیل ہے، ہاں ان سے آنکھیں بند رکھنا یقیناً چھوٹے پن کا ثبوت ہے اقبال

نے مغربی خیالات کی گہرائی میں اُتر کر، اور کہیں انھیں قبول کرکے اور کہیں رد کرکے اپنے اوریجنل مفکر ہونے کا ثبوت دیا ہے، ہاں کانٹ ویل اسمتھ کی اس بات کی تردید شاید مشکل ہو کہ جدید سائنس یا جدید سماجیات کے بارے میں اقبال کی وہ واقفیت نہ تھی، جو جدید فلسفے کے بارے میں تھی، اصل میں فلسفے کے مطالعے نے انھیں اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ موجودہ اقتصادی اور سماجی رشتے پر اس توجہ سے غور کرتے، جس توجہ سے انھوں نے فلسفیانہ مسائل پر غور کیا تھا، غالباً اسی بنا پر کانٹ ویل اسمتھ نے لکھا ہے کہ ”اقبال نے خیالات سے خیالات حاصل کیے نہ کہ واقعات سے، ان کے خیالات صحیح تھے، لیکن انھیں یہ خبر نہ تھی کہ وہ کون سے ٹھوس واقعات ہیں، جنھوں نے ان خیالات کو صحیح بنایا ہے،“ کانٹ ویل اسمتھ کے الفاظ میں ”اقبال اقتصادیات اور سماجیات سے بھی ناواقف تھے اور اسی ناواقفیت کی بنا پر وہ ہندوستان اور اسلام میں اُن جماعتوں کو نہ پہچان سکے جو در اصل انھی کے مقاصد کی ترجمانی کر رہی تھیں، اپنی عملی زندگی میں اُنھوں نے انھی جماعتوں کی مخالفت کی اور ان جماعتوں کی حمایت کی جو ان کے مقاصد کے خلاف کام کر رہی تھیں۔“ لیکن اقبال پر یہ اعتراض کرتے وقت اسمتھ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اقبال کے سامنے مسلمانوں کی بہبود کا ایک اپنا تصور تھا، پہلے تو اقبال کو کھینچ تان کر سوشلسٹ ثابت کرنا اور پھر ان کے سوشلزم پر اعتراض کرنا اور یہ کہنا کہ وہ سوشلزم کے بارے میں یہ نہیں جانتے تھے اور وہ نہیں جانتے تھے، ایک عجیب قسم کی تنقید ہے، اسمتھ اس حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کرتے کہ صحیح یا غلط اقبال مسلمانوں کے مسائل کا علاج سوشلزم کو نہیں، بلکہ اسلام کو سمجھتے تھے اور اسلام بھی وہ نہیں جو مولانا ابوالکلام آزاد نے پیش کیا، بلکہ

وہ جو خود اقبال نے پیش کیا،

اقبال نے اگر کارل مارکس کو پیغمبر کہا ہے تو یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اسے پیغمبر بے جبرئیل اور پیغمبر حق ناشناس کہا ہے، اور اگر اُس کی تصنیف ”سرمایہ“ کو کوئی اہمیت دی ہے، تو یہ کہہ کر کہ ”نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب“، اقبال اگر ملوکیت کے خلاف تھے تو یہ فرض کر لینا ایک خوش اعتقادی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا کہ وہ اشتراکیت کے حق میں تھے، جاوید نامہ میں کس قدر کھل کر انھوں نے دونوں نظریات پر تنقید کی ہے،

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل   یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطل او مضمر است   قلب او مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را   در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک   جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس   بر مساوات شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گل است

ہم ملوکیت بدن را فربہی است   سینۂ بے نور او از دل تہی است
مثلِ زنبورے کہ بر گل می چرد   برگ را بگذارد و شہدش برد
شاخ و برگ و رنگ و بوئے گل ہماں   بر جمالش نالۂ بلبل ہماں
از طلسم رنگ و بوئے او گذر   ترک صورت گوی و در معنی نگر

مرگ باطن گرچہ دیدن مشکل است
گل مخواں او را کہ در معنی گل است

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب — ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب

زندگی ایں را خروج آں را خراج — درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج

ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست — آں برد جاں را ز تن ناں را ز دست

غرق دیدم ہر دو را در آب و گل — ہر دو را تن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن با ساختن

در گلے تخمِ دلے انداختن

صرف یہی نہیں کہ اقبال اشتراکیت اور ملوکیت دونوں کو ایک ہی سطح پر رکھ کر روشن تن اور تاریک دل کہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اخوت کا مقام دل میں ہو نہ کہ آب و گل میں اور اسی نظریے کی وضاحت کے لئے وہ اشتراکیت اور ملوکیت پر شدید نکتہ چینی کے فوراً بعد محکماتِ عالمِ قرآنی کا باب لاتے ہیں، اور خلافتِ آدم حکومتِ الٰہی، ارض ملکِ خدا است اور حکمت خیرِ کثیر است کی وضاحت کرتے ہیں تاکہ اشتراکیت اور اسلام کا فرق پوری طرح واضح ہو جائے، صرف یہی نہیں بلکہ جمال الدین افغانی کی طرف سے روس کو مسلمان بن جانے کا پیغام بھی دلواتے ہیں،

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی — دل ز دستورِ کہن پرداختی

ہمچو ما اسلامیان اندر جہاں — قیصریت را شکستی استخواں

تو بجاں افگندۂ سوزِ دگر — در ضمیرِ تو شب و روزے دگر

کردۂ کارِ خداونداں تمام — بگذر از لا جانبِ الّا خرام

در گذر از لا اگر جویندۂ — تا رہِ اثبات گیری زندۂ

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے — جستۂ او را اساسِ محکمے؟

اس سوال کے بعد جمال الدین افغانی روس سے سوال کرتے ہیں کہ لا قیصر و کسریٰ کا مژدہ کس نے دیا، جواب ظاہر ہے کہ قرآن اور اسلام نے اور بقول اقبال

چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

ان اشعار کی موجودگی میں کانٹ ویل اسمتھ کا اقبال پر یہ اعتراض کرنا کہ

ہمچناں بینی کہ در دورِ فرنگ — بندگی با خواجگی آمد بجنگ

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں — از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں

آں نظامِ کہنہ را برہم زد است — تیز نیشے بر رگِ عالم زد است

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ — لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ

فکرِ او در تندبادِ لا بماند — مرکبِ خود را سوئے الّا نراند

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں — خویش را زیں تندباد آرد بروں

در مقامِ لا نیاساید حیات — سوئے الّا می خرامد کائنات

لا و الّا ساز و برگِ امتاں — نفیِ بے اثبات مرگِ امتاں

در محبت پختہ کے گردد خلیل — تا نگردد لا سوئے الّا دلیل

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن — نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن

ایں کہ می بینی نیرزد با دو جو — از جلالِ لا الٰہ آگاہ شو

ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لاست

جملہ موجودات را فرماں رواست

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

اقبال اصول کی وضاحت میں انتہائی جدید ہیں، اور انھیں عملی صورت دینے کا وقت آتا ہے تو ان کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں، چنداں اہمیت نہیں رکھتا، کسی بھی سوشلسٹ کی طرح سے اقبال کے مقصدحیات کو غلط تو قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن ایک ایسا مقصد ان کی حیات سے وابستہ کرکے جو در اصل اُن کا مقصد حیات نہیں ہے، ان کے بارے میں یہ کہنا کہ "جذباتی اعتبار سے وہ سوشلسٹ تھے، ذہنی اعتبار سے وہ سوشلسٹ نہیں تھے" "وہ تجزیاتی طور پر یہ نہیں جانتے تھے کہ سرمایہ داری میں کیا خرابی ہے" انھوں نے اشتراکیت کے بارے میں مختلف قسم کا اظہار کیا ہے، ان کی تحریروں سے سوشلسٹ قسم کا تاثر جھلکتا ہے" "آخر میں اُنھوں نے کئی اشتراکیانہ نظمیں کہیں اور انھوں نے مغربی تہذیب کی مخالفت میں مارکس کا نام استعمال کیا"، لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ انھیں اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ اشتراکیت کیا ہے" بالکل بے سروپا باتیں ہیں، اور ایک ایسے طالب علم کی جو صدق دل سے اقبال کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے، کوئی رہنمائی نہیں کرتیں، اقبال کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اشتراکیت کیا ہے اور پھر اُن کے کلام کو "اشتراکیانہ" قرار دیکر اُس پر بحث کرنا اقبال کو ان کی شخصیت سے باہر جاکر دیکھنے کی کوشش ہے، کسی بھی ماہرفن کا مطالعہ اس کی شخصیت سے باہر جاکر نہیں کیا جاسکتا،

"جاوید نامہ" تو خیر ۱۹۳۲ء کی کتاب ہے، "ارمغان حجاز" علامہ کے انتقال کے بعد منظر عام پر آئی اور اس میں ۱۹۳۵ء کے بعد کا کلام بھی ہے، اس کتاب کے حصہ اردو میں پہلی نظم ہے، ابلیس کی مجلس شوریٰ، اس نظم میں اقبال اپنے اس موقف پر پوری طرح قائم ہیں، کہ مسائل حیات کا حل اسلام کے ہاتھ میں ہے،

سوشلزم یا کمیونزم کے ہاتھ میں نہیں، ابلیس نے ابتدا ہی میں دنیا کو عناصر کا پرانا کھیل کہہ کر اور یہ کہہ کر کہ کارساز نے اس کا نام جہانِ کاف و نون رکھا تھا نظریہ اسلام کی مخالفت کی ہے، یہ صحیح ہے کہ ابلیس اس بات کا بیک وقت دعویٰ کرتا ہے کہ

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب — میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا — میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

لیکن نظم کے گہرے مطالعے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ ابلیس اپنا دشمن اول اشتراکیت کو نہیں بلکہ اسلام کو سمجھتا ہے، اس تمثیلی نظم میں ابلیس کا دوسرا مشیر پہلے مشیر سے جمہوریت کے بارے میں سوال کرتا ہے

خیر ہے سلطانیِ جمہور کا غوغا کہ شر؟

پہلا مشیر اسے بتاتا ہے کہ یہ جمہوریت تو در اصل ملوکیت ہی کا ایک پردہ ہے، اس سے ہمیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے،[1]

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس — جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے — یہ وجود میر و سلطان پر نہیں ہے منحصر

تیسرا مشیر اس بات پر بڑے اطمینان کا اظہار کرتا ہے کہ جمہوری نظام میں روحِ ملوکیت باقی ہے، لیکن وہ روس میں اشتراکیت کے عروج پر بہت پریشان ہے چنانچہ

---

[1] ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتار اعضائے مجالس الاماں — یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
(بانگِ درا)

اس پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتا ہے،

روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب

وہ کلیم بے تجلی وہ مسیح بے صلیب نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روزِ حساب

اس سے بڑھکر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

چوتھا مشیر اس کو بتاتا ہے کہ اس یہودی یعنی کارل مارکس کی تعلیم اور سیاست کا

توڑ مسولینی ہے جو ایک بار پھر بحیرۂ روم کے چاروں طرف اپنا اقتدار قائم کرنے

کے لئے کوشاں ہے، یہ سن کر تیسرا مشیر مسولینی کو ناعاقبت اندیش کے لقب سے نوازتا

ہے، کہ یہ اشتراکیت کا کیا توڑ پیدا کر سکتا ہے، اس نے تو اپنے طرزِ عمل سے مغربی

سیاست کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے، اب پانچواں مشیر ذرا کھل کر سیاسیات مشرق

و مغرب پر بات کرتا ہے، اور پوری شدت کے ساتھ اشتراکیت کو اپنی تنقید کا

ہدف بناتا ہے اور کہتا ہے، کہ اب کارل مارکس نے جس فتنہ کی بنیاد ڈالی ہے، اس کی

بدولت باقی تمام نظام درہم برہم ہو جائیں گے اور انجام کار اشتراکیت ہی

اشتراکیت ساری دنیا پر غالب آجائے گی،

اس کے بعد ابلیس خود ساری صورتِ حال پر تبصرہ کرتا ہے اور ایک ایک

مشیر کی بات کا جواب "سوچ سمجھ کر" دیتا ہے، اور ان سے کہتا ہے،

دستِ فطرت نے کیا ہو جن گریبانوں کو چاک مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو

گویا اشتراکی نظام کے معرضِ وجود میں آجانے سے بالکل کوئی تشویش نہیں ہے بلکہ

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

ابلیس یہاں آکر اپنی گفتار کو مبہم نہیں رہنے دیتا اور بڑی وضاحت سے کہتا ہے،

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

یہاں تیسرے مشیر کے اس اضطراب آمیز اظہار خیال :-

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

کے جواب میں ابلیس کا اضطراب ملاحظہ ہو کہ

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں[1]

اس طرح ساری نظم ابلیس کی اس پریشانی کی تصویر ہے، جو اسلام کے سبب

سے اس کے دل و دماغ میں موجود ہے، چنانچہ وہ اپنے مشیروں کو،

یہ مشورہ دیتا ہے

ہے یہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے

پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اقبال کے ان اشعار کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال

مغربی یورپ کے جمہوری نظام پر اشتراکی نظام کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن اشتراکی

---

[1] یہاں اقبال ایک طرح سے زمین کی ملکیت کے بارے میں اشتراکیت پر اسلام کی

برتری ظاہر کر رہے ہیں،

نظام کے مقابلے میں اسلام کو بدرجہا بہتر نظام سمجھتے ہیں، اس لئے کانٹ ویل اسمتھ
اور ان کے ہم خیال سوشلسٹ نقاد اقبال کو سوشلسٹ کہہ کر ان پر اسلامی سوشلسٹ
ہونے کا اتہام لگانے کے عوض اگر اقبال کو سوشلسٹ نہیں بلکہ مسلمان تسلیم کریں
تو غلط بحث کا بڑی حد تک خاتمہ ہو جائے گا، اس صورت میں سوشلسٹ طرز فکر کے
نقادوں کے اعتراض کی نوعیت بھی بڑی حد تک بدل جائے گی، انھیں اس بات
کا توحق ہوگا کہ اسلام کے مقابلہ میں اشتراکی نظام کو بہتر قرار دیں، لیکن یہ کہنے
کی گنجائش نہیں ہوگی کہ اقبال تھے تو سوشلسٹ لیکن وہ سوشلزم کی حقیقت سے
بے خبر تھے،

اقبال کامل

عمید لویکی

از

پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ڈاکٹر نور السعید اختر صاحب استاد شعبۂ فارسی مہاراشٹر کالج بمبئی نے رسالہ معارف
کے دسمبر ۷۵ء اور جنوری ۱۹۷۶ء کے دو شماروں میں فخر الملک فضل اللہ عمید لویکی پر
ایک مضمون لکھا ہے اور اس میں عمید کے نو دریافت دیوان کی روشنی میں اس کے حالات
اور کلام پر گفتگو کی ہے، مگر اس مضمون میں اہم غلطیاں باقی رہ گئی ہیں، اس کی وجہ
یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے نہ عمید سے متعلق مواد کا کماحقہ مطالعہ کیا ہے، اور نہ وہ دیوان
عمید سے پوری طرح شناسائی حاصل کر سکے ہیں،

راقم حروف کو عرصے سے عمید سے دلچسپی رہی ہے، چنانچہ میری کوشش نے اخذ کی
دریافت پر مرکوز رہی، اس کے نتیجہ میں مجھے منتخب التواریخ بدایونی اور عرفات عاشقین
تقی اوحدی کے علاوہ خلاصۃ الاشعار مولفہ تقی کاشی کے نسخہ بانکی پور کے اس جزو سے
بھی استفادہ کرنے کا موقع ملا، جو خود مولف کے قلم سے بطور ضمیمہ ملحق ہے اس کے ساتھ
ہی دو اہم بیاضوں یعنی مونس الاحرار کلاتی تالیف ۷۰۲ھ، اور مونس الاحرار جاجرمی تالیف
۷۴۱ھ میں عمید کے کچھ کلام تک رسائی ہوئی، اسی ضمن میں مجلۂ ارمغان میں عمید کی چند نظمیں

ملیں جو مرحوم وحید دستگردی نے کسی پرانی بیاض سے منتخب کر کے شائع کر دی تھیں،
آخر میں فرہنگ جہانگیری کے سوا زیادہ متفرق ابیات جمع ہوئے جو الفاظ کے معانی
کی تشریح و توضیح کے ضمن میں شامل ہوتے گئے تھے، ان میں سے کچھ فرہنگ سروری مولانا
سروری کاشانی میں بھی درج ہوئے ہیں، غرض ان نئے ماخذ کی مدد سے راقم نے عمید پر ایک
مفصل مضمون رسالہ فکر و نظر علی گڈھ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں شائع کیا، دو سال
بعد عمید کے کلام کو ایک ایم۔ اے کے طالب علم نے اپنے ایک مقالہ کے لئے جمع کرنے
کی کوشش کی، اس وقت ایک اہم ماخذ کا پتہ چلا یعنی شرح مشکلات انوری مولفہ ابوالحسن فراہانی
جس میں عمید کے چند اشعار بطور حوالہ کے درج تھے، یہ اشعار ایسے دو قصیدوں سے ماخوذ
ہیں جو مونس الاحرار کلاتی میں عمید کے نام درج ہیں، لیکن میں نے انھیں اکتوبر والے
مضمون میں مع اور دو قصیدوں کے الحاقی قرار دیا تھا، بہرحال شرح مشکلات انوری
سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ چاروں قصیدے عمید ہی کے معلوم ہوتے ہیں، اسی دوران
تاریخ بہادر خانی میں ایک تاریخی قصیدہ کی ۱۹ ابیات کا سراغ ملا جو عمید لویکی نے
سلطان علاء الدین مسعود پسر سلطان التمش کی فتح اچہ کے موقع پر کہے تھے،

عمید کے یہ سارے اشعار مدون ہو چکے تھے، لیکن ان کی اشاعت نہیں ہوئی تھی،
اس لئے کہ مجھے دیوان عمید کی دریافت کا امکان تھا، جیسا کہ اکتوبر ۱۹۶۴ء والے مضمون
کے حاشیہ میں ذکر کیا تھا،

تین سال ہوئے یہاں مجھے فخر احمد انصاری صاحب مدرس بیگ محمد ہائی اسکول بمبئی

۱؎ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مجلہ ارمغان خلاصۃ الاشعار اور مونس الاحرار میں ایسا کلام بھی شامل ہے جن میں بعض کی نسبت غلط اور بعض کی مشکوک ہے، اس کی بحث میرے مضمون میں شامل ہے،

کا ایک خط ملا، اس میں انھوں نے ایک ایسے نسخے کا ذکر کیا جو ان کے اپنے قیاس
کے مطابق تغلق دور کے کسی عمید کا دیوان تھا، راقم کی سفارش پر یہ نسخہ مسلم یونیورسٹی
لائبریری نے خرید لیا، یہی نسخہ ہے، جس پر ڈاکٹر نور السعید صاحب کا مضمون مبنی ہے،
اس نسخے کے مطالعے کے بعد راقم نے پہلی فرصت میں ایک مضمون ہادی حسن ہال
مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی طرف سے شائع ہونے والے رسالے کے لئے لکھا، لیکن نہ معلوم
کن وجوہ کی بنا پر دو سال سے زیادہ ہونے کو آئے اور وہ رسالہ نہ چھپا اور نہ
اس کے ایڈیٹر نے مضمون ہی واپس کیا، بہرحال وہ مضمون تو ضائع ہو گیا، البتہ
دیوان عمید کا تنقیدی متن تیار ہے، جو عنقریب تہران سے شائع ہوگا، اس کے مقدمے
میں عمید کی زندگی اور اس کے کلام وغیرہ پر مفصل بحث شامل ہے جیسا کہ عرض ہو چکا ہے، ڈاکٹر
نور السعید صاحب کا مضمون اغلاط سے پر ہے، اس لئے ذیل کے اوراق میں ان کی
نشاندہی کر دی جاتی ہے،

دسمبر ۱۹۷۵ء کے معارف میں عنوان یہ رکھا گیا "فخر الملک خواجہ فضل اللہ عمید تولکی"
تولکی سراسر غلط ہے، لویکی صحیح نسبت ہے، عمید کے اشعار میں یہ نسبت درج
ہے، اور وہ اشعار فاضل مضمون نگار کے سامنے ہیں "تولکی" کے اندراج سے اشعار
وزن سے خارج ہو جاتے ہیں، پھر بھی اس کی صحت پر اصرار ہے، اس ضمن میں
ایک شعر نقل کر رہا ہوں،

فلکا بزیر شفقت چو عمید لویکی کس نہ نہد بکاخ معنی ز چنین قصیدہ سلم

"لویکی" کی جگہ "تولکی" پڑھئے تو مصرع وزن سے خارج ہو جائے گا، اس سلسلے
کی مفصل بحث آگے آتی ہے، پھر اسی شمارہ کے ص ۴۵۵ پر ہے:-

"کلام عمید کے مخطوطے کا تعارف .... ایک قدیم مخطوطہ ہے، جس میں شہنشاہ محمد بن تغلق کی بابت کافی حوالے موجود ہیں، ..... اس مخطوطے کے مزید مطالعہ کے بعد یہ راز کھلا کہ اس میں دو اہم شعراء کا کلام موجود ہے، یہ کلیات کل ۳۵۸ صفحات پر مشتمل ہے، ابتداء سے لیکر ۲۶۰ صفحات تک عہد تغلق کے مشہور قصیدہ گو شاعر بدر الدین بدر شاشی (موجودہ تاشقند) کا کلام موجود ہے، اور اس کے بعد سے اختتام تک فخر الملک خواجہ فضل اللہ عمید کا کلام جس میں قصائد، نعتیں، غزلیں اور چند رباعیاں بھی موجود ہیں، ..... مخطوطے کی ابتدا ر بدر شاشی کے قصیدے کے اس شعر سے ہوتی ہے،

ز نور قبۂ زرّیں آئینہ تمثال — زمیں تفتہ فرو پوشد آتشیں سربال

انتہا عمید کے شاندار قصیدے کے اس شعر سے ہوتی ہے:-

دستان تو ار مدح شد خاطر عمید — زاں ساں کہ شد جرس وہمہ دستان ازل"

اس بیان میں جو فروگذاشتیں ہیں وہ درج ذیل ہیں:-

(۱) اس میں دو شاعروں کا نہیں بلکہ تین شاعروں کا کلام ہے،

ورق ۱-۷۰، ازرقی ہروی (م: ۵۲۶-۵۲۷) کا کلام ہے،

ورق ۷۱-۱۲۶، بدر چاچ کا کلام ہے،

ورق ۱۲۷ تا آخر تک عمید لویکی کے اشعار ہیں،

مخطوطے کی ابتدا ر ازرقی کے شعر سے ہوتی ہے، نہ کہ بدر چاچ کے شعر سے، مندرجہ بالا بیت یعنی ز نور قبۂ زرّیں الخ در اصل ازرقی کے مشہور لامیہ قصیدہ کا مطلع ہے، جو دیوان مطبوعہ ص ۸۰ تا ۸۴ درج ہے، بیان بالا میں دوسرا مصرعہ کچھ غلط درج ہو گیا

ہے، صحیح صورت یہ ہے:- زمین تفتہ فرو پوشد آتشیں سربال

اس مخطوطے میں ازرقی کا آخری قصیدہ جو ڈاکٹر نور السعید اختر صاحب کے بقول بدر چاچی کا ہے، اس طرح ہے:-

رخسار و قد و زلف و بناگوش یار من — ماہ ہست بر صنوبر و مشکست بر سمن

قصیدے کی آخری بیت جو مخطوطے میں نقل ہے، یہ ہے،

تقصیر بی قیاس دمرا زوی عذر نہ — تقصیر عفو کن و بپذیر عذر من

لیکن مطبوعہ دیوان میں اس قصیدے میں حسب ذیل دو بیت اس کے بعد اور موجود ہیں

تا از حد دو غرب ندانند کسی ختا — تا از دیار شرق نخواہد کسی یمن

برہر سری ز نعمت خود بہرہ فشاں — برہر تنی ز کردۂ خود منتی فگن

(دیوان ص ۶۴)

اس سے واضح ہے کہ دیوان ازرقی ناقص طور پر نقل ہوا ہے، ایسا خیال ہوتا ہے کہ نسخۂ منقول عنہ ناقص تھا، لیکن کاتب نسخۂ زیر نظر کو اس نقص کا اندازہ نہ ہوا، اور اس نے بدر چاچ کا قصیدہ بغیر کسی عنوان کے نئے صفحہ پر نقل کرنا شروع کر دیا، اتفاق یہ بھی ہے کہ بدر چاچ کے اس قصیدے کی ابتدائی ابیات غائب ہیں، پہلی بیت یہ ہے:-

آنچناں آراستہ پیرایۂ تدبیر او — چشم و ابرو را کہ گوئی در ہلال اختر است

مطبوعہ دیوان (ص ۲-۳) کے مقابلے سے معلوم ہوا کہ اس قصیدے کی ابتدائی نو ابیات محذوف ہیں، مطلع قصیدہ یہ ہے:

حمد آں سلطان عالم را کہ عالم پرور است — آنکہ او در راہ ایماں انس و جاں را رہبر است

بدر چاچ کا آخری منظومہ جو اس مخطوطے میں نقل ہے، وہ ایک قطعہ ہے جس کے حسب ذیل دو اشعار مندرج ہیں:۔

اگرچہ دریم قدم از قطرہ کمتریم   ملک دو کون را بیکی جو نمی خریم
دربرکشیم دہرۂ قہر از میان حکم   چون تیغ دہرۂ شکم چرخ بر دریم

یہ قطعہ مطبوعہ دیوان (ص ۱۰۵) میں ۱۵ ابیات پر مشتمل ہے، واضح ہے کہ آخری ۱۳ ابیات غائب ہیں، مختصر یہ کہ بدر چاچ کا حصہ ناقص الطرفین ہے، اور یہ نقص نسخے کا نہیں بلکہ خود کاتب ہی نے ایسا ہی نقل کیا تھا،

ازرقی ہروی اور بدر چاچ دو الگ الگ شاعر ہیں، اور دونوں کے زمانے میں دو سو سال سے زیادہ کا فرق ہے، پھر ازرقی کے اکثر ممدوح کا ذکر قصیدوں میں آگیا ہے، مثلاً طغان شاہ بن الپ ارسلان سلجوقی، ابو المظفر میران شاہ بن قاورد، تاریخ ادب ایران کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہو کہ الپ ارسلان سلجوقی کا بیٹا دور تغلق سے کیونکر تعلق رکھتا؟

(۲) بیان ہوا ہے کہ عمید کے کلام میں قصائد، نعتیں، غزلیں اور رباعیاں ہیں، بلاشبہ قصائد ہیں، اس کے بعد قطعے، نعت کو اصناف سخن کے ساتھ ذکر کرنا بے محل ہے، غزلیں ایک بھی نہیں اور محض ایک رُباعی موجود ہے، اکثر قصائد و قطعات نعتیہ ہیں،

(۳) آخری بیت عمید ہی کی ہے، جو غلط طور پر اس طرح درج ہوئی ہے، کہ ساقط الوزن ہو گئی ہے، صحیح صورت یہ ہے:۔

زان سال کہ شد جرس ہمہ دستان نوازپیل   دستان نواز مدح تو شد خاطر عمید

معارف کے اسی شمارہ کے ص ۳۵۴ پر ہے:

"تا ابد از وی گرفت نام نام"

یہ مصرعہ ساقط الوزن ہے، دراصل یہ ایک التزامی ترکیب بند سے ماخوذ ہے، جس میں صنعت قوافی مکرر کا استعمال ہر بیت میں ہوا ہے، اس کا ایک بند اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

خاص گیتی تراست رافت و انعام عام   رایض دست تو کرد توسن اکرام رام

اسی بند میں مطلوبہ بیت اس طور پر ہے:۔

بندہ عمید از ثنات صیت موبد گرفت   تا ابد از وی چنانک یافتہ نام نام

دراصل یہ منظومہ دیوان میں شامل نہیں ہے، مونس الاحرار کلائی میں پورا نقل ہے، تین بند مجموعۂ لطائف، چھ بند خلاصۃ الاشعار، تین بند عرفات عاشقین، دو بند ارمغان اور ایک بند ریاض محمد بن یغمور میں درج ہے، پھر اسی معارف کے ۳۵۵ پر ہے:

"راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق عمید کا پورا نام عمید الدین نہیں بلکہ فضل اللہ تھا، اس امر کی تصدیق مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتی ہے،

عمید اسم تو فضل اللہ بودی منزل از گردون   اگر بر فرق تو سایہ ندارد فضل ہستی،

عمید نے ایک طویل نعت میں اس حقیقت کی طرف دوبارہ ہماری توجہ مبذول کی ہے، وہ کہتے ہیں:۔

مباد در دو زبان عمید سوختہ دل   بوقت شغل مگر لا الٰہ الا اللہ
ودیعت ساختم آنکہ کہ نخواندش بچہ بار   دہم بخلد مفر لا الٰہ الا اللہ"

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ عمید کا نام فضل اللہ تھا، اس کی تائید میں صرف ایک شعر نقل

ہے، اشعار غلط درج ہیں، البتہ شعر کا دوسرا مصرعہ غلط طور پر نقل ہوا ہے بلکہ خارج از وزن ہی ہے، صحیح صورت یہ ہے:

اگر برق تو سایہ نہ از فضل الٰہی

یہ بیت ایک قطعہ سے ماخوذ ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

اگر یک ذرہ نورش بہ اسوی آفاق راہستی زمین و آسمان بیشک پُر از خورشید و ماہستی

علاوہ بریں دُوسرے اشعار سے عمید کے نام پر استدلال محض غلط ہے، ان کا مطلب یہ ہے، خدا کرے سخت گھڑی میں (جب جاں کنی کا عالم ہو) عمید سوختہ دل کی زبان پر سوائے کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے کچھ اور نہ ہو، میں نے اس نظم میں ایسا فقرہ (اسم) ردیف گردانا ہے، جس کا بار بار (یعنی چند بار) پڑھنا جنت میں لے جانے کی ضمانت ہے، اس فقرے سے نظم کی ردیف یعنی لا الٰہ الا اللہ مراد ہے، خود شاعر کے نام سے کوئی تعلق نہیں، نہ وہ ردیف ہے، اور نہ اس کے پڑھنے اور تکرار کرنے کا کوئی موقع ہے، شغل کے بجائے ثقل، خواندش کے بجائے خواندنش اور مفر کے بجائے مقر صحیح الفاظ ہیں، پھر معارف کے اسی صفحہ پر یہ ہے:

”عمید کے خطاب اور عہدے کی طرف عہد تغلق کے ملک الشعرا بدرالدین بدر شاشی نے کافی اشارے کئے ہیں،.... لہٰذا بدر شاشی کے اشعار ملاحظہ ہوں جو غالباً عمید کا شاگرد رہا ہوگا، یا اس درجے کا ہوگا کیونکہ اس نے عمید کو ایک بزرگ تسلیم کیا ہے،

ایا بزرگ عمیدی بجا پایۂ قدر بہرچہ داہم مدورہ بزد تو رذ بری

ز روشنی رخ او گفتی مثال پند ز رای روشن خواجہ عمید ملک پناہ

فخار آل سری خواجہ عمید شرف وزیر راو شہنشاہ ابن شاہنشاہ

ایا بزرگ عمیدی کہ از معانی خوب عروس نظم پر یرو ز مدح تو زیور

یہ پورا بیان مہمل ہے، بدر شاشی بغیر کسی ادنیٰ قرینے کے عمید کا شاگرد قرار دیا گیا، اگر شاگرد نہ سہی تو کم از کم ”اس درجہ کا ہوگا“، یعنی چہ؟ یہ سب کیوں، اس لئے کہ بدر شاشی عمید کو ایک بزرگ (دینی؟) سمجھتا ہے، بزرگی کی یہ نسبت دو شعروں میں موجود سمجھی گئی ہے، حالانکہ ”بزرگ عمید“ کے معنی بڑے درجے کے عمید، صدر اور وزیر ہوئے نہ یہ کہ بڑے بزرگ، اب ذرا دونوں کے زمانے پر غور کیجیے، عمید کی تاریخ پیدائش ۶۰۱ ہجری اور بدر شاشی ۷۴۵ ہجری میں خاصا تنومند، گویا دونوں کی عمروں میں سو سال کا فرق ہوگا، یہ رہا استاد و شاگرد کا معاملہ، لیکن یہ سب باتیں اس وقت درخور توجہ ہوتیں، جب ان اشعار کا مصنف بدر شاشی ہوتا، یہ اشعار تو ازرقی ہروی (م ۵۲۶) کے ہیں جو عمید کے سو سال سے زیادہ متقدم ہے، اور اس پر مستزاد کہ ان ابیات کا مخاطب ایک عمید ہے، جس کا پورا نام ابوالحسن علی بن محمد ہے، اور یہ نام خود قصیدوں میں موجود ہے، نام کی موجودگی کے باوجود عمید جس کا نام فضل اللہ ہے، ابوالحسن علی بن محمد کیونکر ہو سکتا ہے، اور جب یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو کہ ڈاکٹر نورالسعید صاحب نے قصیدہ پڑھ کر دیدہ و دانستہ یہ اشعار فضل اللہ عمید کی طرف منسوب کئے ہیں تو پھر اسے کیا کہیے،

ڈاکٹر نورالسعید کے نقل کئے ہوئے چاروں اشعار تین قصیدوں کے ہیں، اور یہ تینوں قصیدے مطبوعہ دیوان ازرقی میں موجود ہیں، چنانچہ ان میں سے متعلقہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں، تا کہ ممدوح کے سلسلے میں کوئی اشکال باقی نہ رہے، پہلی بیت کے سلسلے کے ابیات ملاحظہ ہوں،

بری رخی کہ ز شرمش نہان شد ست پری پری مثال نہان گشت و شد ز مہر بری

کسی کہ طبع من اندر مدیح او دارد — بقیمت دُور دریا ہزار دُر دری

سدید دین شرف دولت آفتاب کرم — ابوالحسن علی بن محمد بن سری

خدایگانی آزادہ کہ درگہ جود — خزینہ ایست از و یک عطای ماحضری

چو روزگار مہ و سال اہرا و جاریست — چو آفتاب شب و روز نام او سفری

ایا بزرگ عمیدی بجاز پایۂ قدر — بہر چہ وہم بدو رہ برد تو زو زبری

(دیوان ص [illegible])

دوسری اور تیسری ابیات ایک دوسرے قصیدہ کی ہیں، اس کے چند ضروری شعر یہ ہیں:

چو کوس عید زد رگہ بکوفتند پگاہ — پگاہ رفت بعید آں نگار زی درگاہ

ز روشنی رخ او گفتی مثال ستد — ز رای روشن خواجہ عمید ملک پناہ

فخار آل سری خواجۂ عمید شرف — وزیر زادۂ شاہنشہ بن شاہنشاہ

ابوالحسن علی بن محمد آنکہ بدوست — جمال مسند و صدر کمال و آلت جاہ

(دیوان ص [illegible])

چوتھی بیت کے سلسلے کے بعض وہ اشعار جن میں ممدوح کا ذکر ہے، درج ذیل ہیں:

چہ روز بود کہ آں ماہ روی سیمیں بر — برسم تعبیہ بیروں گذشت بر لشکر

نظر ز روی تو خواہد نکوئی از ہر باب — چنانکہ ذاتش خواہد ز رای خواجہ نظر

ابوالحسن علی بن محمد آنکہ از دست — کمال دولت و اصل سخاوت و قدر خطر

خدایگانی کز جاہ او شرف خواہد — بکامگاری سیر ستارہ در محور

ایا ستودہ سیر مہتری کہ نور خرد — ہمی ز نور تو آموخت اختیار سیر

ایا بزرگ عمیدی کہ از معانی خوب — عروس نظم پذیرد ز مدح تو زیور

(دیوان ص [illegible])

ان اشعار کے ملاحظے کے بعد اس بات میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہ جاتا کہ

فاضل مضمون نگار نے دیدہ و دانستہ ان اشعار کو نقل کرنے سے گریز کیا ہے، جن میں ممدوح کا نام آیا ہے، اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اُن کے قیاس کی تائید کا کوئی موقع نہ تھا، جن قصائد میں ابوالحسن علی بن محمد کو ممدوح قرار دیا گیا ہے وہی قصیدے فضل اللہ کے کیسے ہو سکتے ہیں، دو مختلف ناموں کو ایک بتانے کی ایسی عجیب مثال کہاں ملے گی

ضمناً عرض ہے کہ ابوالحسن علی بن محمدؔ ازرقی کا پسندیدہ ممدوح تھا، جو اپنے دور کے کسی مشہور خانوادہ آل سری کا رکن تھا، دیوان ازرقی میں سات قصیدے اس کی مدح میں پائے جاتے ہیں، تین کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، بقیہ چار قصیدوں کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں جن میں ممدوح کا ذکر ہے:

بفرخی و سعادت بخواہ جام شراب — کہ باز باغ برید از پرند سبز ثیاب

ابوالحسن علی بن محمد آنکہ بدوست — بلند نعمت و بخت و ستودہ حشمت و آب

ایا عمیدی کا عدای تو چشیدہ ستند — ز تیغ مرگ سیاست ز نفط بخت عتاب

(دیوان ص [illegible])

رخسار و قد و زلف بناگوش یار من — ماہ ست بر صنوبر و مشک ست بر سمن

مہر نگار یاسمن اندام ماہ روی — مدح سدید دین شرف الملک بوالحسن

در غیبت تو سال دو از گونہ گونہ رنج — بر تارکم گذشت بناکام من حزن

امروز چوں بہ طلعت و فر تو در رہی — سر بر فراخت دولت و بفروخت انجمن

(دیوان ص [illegible])

سوسن و سنبل نمود از زلف و عارض یار من — سنبلی بس بابلاد سوسنی بس یافتن

فخر از یں بہتر بود کز وصف تو پیدا کند — مدحت عالی علی بن محمد بوالحسن

(دیوان ص [illegible])

مہرگاں نو در آمد بس مبارک مہرگاں — فال سعد آورد و روز فرخ و بخت جواں

کیمیای جود و مردی شد از آں معنی کہ او — بوی دست خواجہ یابد روز بزمش یکزماں

زینت دولت علی بن محمد بو الحسن آنکہ حسن دولت از تدبیر او زد و داستان

(دیوان ص ۳۳، ۳۴)

مجلۂ معارف کے اسی شمارہ کے ص ۵۶ ۴ پر ہے:

"ذیل کے قصیدے میں بھی بدر ناشی عمید کی بزرگی، سخن فہمی، علمیت، اور اس کی مربیانہ صفات کا معترف ہے:

منت تو گردن من بندہ را ۱ سخت یک بارگہ انبار کرد

بندہ مدیح تو بمقدار گفت ۲ جود تو احسان نہ بمقدار کرد

قیمت شعر تو از تو یافت ۳ ہر کہ خریداری اشعار کرد

چشم دلم تیرہ در خواب برد ۴ جود تو اش روشن و بیدار کرد

در شعر نامم ظاہر نبود ۵ بخشش تو نام من اظہار کرد

مرادوان دریائی نہ کرد عطاست ۶ بمہر و مدح ہمی بر درم روان و بان

روان بمہر نگاری کہ دست فخر ہمی ۷ زبان بمدح بزرگی کہ دست فخر زمان

وجیہ دولت ابو عاصم آنکہ عصمت او ۸ ہمی حصار کند بر حریم جود و سخان

مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عمید کی علمی فضیلت کے پیشِ نظر بادشاہ وقت نے اسے فخر زمان اور ذہنی مرتبے کے مدنظر فخر الملک جیسے اعلیٰ خطاب سے نوازا ہوگا"

اشعار منقولۂ بالا میں عام غلطیوں کے علاوہ بعض مصرعے وزن سے خارج ہیں، مثلاً پہلی بیت دوسرا مصرعہ، تیسری بیت پہلا مصرعہ، پانچویں بیت پہلا مصرعہ، چھٹی بیت پہلا مصرعہ، آٹھویں بیت دوسرا مصرعہ، ان کی تصحیح اس طرح ہوگی،

سخت یکبار کے بجائے سخت بہ یکبار

قیمت شعر تو از تو " قیمت شعر از تو

در شعر " در شعرا

مرادوان دریائی کرد عطاست کے بجائے مرادوان و زبانی ز کرد و کار عطاست

جود او سخان کے بجائے حریم او سبحان

پہلی بیت کردن " گردن

چوتھی بیت، برد " بود

چھٹی بیت، بر درم " بر درم

اب میں اس بیان کی فرو گذاشتوں کی طرف توجہ کرتا ہوں، اور جن دو منظوموں کے اشعار منتخب ہوئے ہیں، اُن کو قصیدہ بتایا گیا ہے، یہ دراصل دو قطعے ہیں، مزید یہ ازرقی کی تصنیف ہیں، بدر ناشی سے اس کا دور دور کا تعلق نہیں،

اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ پہلے قطعہ میں ممدوح کا نام درج نہیں اور نہ ادنیٰ قرینہ موجود ہے، جس سے ممدوح کا تعین ہو سکے۔ ڈاکٹر نور سعید صاحب کو خوب سوجھی کہ عمید سے کوئی سوا سو سال پہلے کے دیوان کے ایک قطعہ کو بغیر کسی ادنیٰ قرینے کے عمید کی ملکیت قرار دے دیا، دوسرے قطعہ کا معاملہ اور بھی زیادہ دلچسپ ہے، یہ قطعہ ازرقی نے کسی شخص وجیہ الدولہ ابو عاصم کے لئے لکھا تھا، چنانچہ ممدوح کا نام قطعہ میں موجود ہے، مگر ستم ظریفی ملاحظہ ہو، ازرقی کے دیوان کا وجیہ الدولہ بدر ناشی کا فضل اللہ عمید قرار دے دیا گیا، گویا اپنی جگہ یہ بات بھی درست نہیں کہ بدر ناشی کا ممدوح فضل اللہ ہے، غرض پورا بیان نہملات کا مجموعہ ہے،

ص ۷۰۵ پر ہے:

"راقم کا خیال ہے کہ عمید کا آبائی وطن تومک (ذابل) ایران ہے جو کابل اور زاہدان کے درمیان واقع ہے، ممکن ہے کسی نے کلیات بدر نقل کی ہے، تو فضل اللہ عمید تولکی کا دیوان بھی اسی کے ساتھ نقل کر دیا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ تومسک کو کاتبوں نے تومک، تولکی نقل کیا ہو، تذکرۂ علماے ہند کے مؤلف رحمان علی نے ص ۱۰۷ پر ایک بزرگ بنام حافظ تولکی (تاشکندی) کا ذکر خیر کیا ہے، ..... تولکی اور تومک کی قربت ہمارے خیال کو یقین میں بدل دیتی ہے، ویسے خود عمید نے تولکی ہونے کا دعویٰ کیا ہے:

فلکا بزیر سقفت عمید تولکی کس مشہد بکاخ معنی ز جنس قصیدہ سلم (کذا)

اسی نعتیہ قصیدے میں عمید رستم کے ملک مازندران کی طرف بھی اپنی نسبت ظاہر کرتا ہے:

حشر عزا گرفتہ ہمہ دار الملک کسریٰ وطنی گزیدہ اکنوں بمقامگاہ رستم

اس ساری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ تومسک (روس) عمید کا آبائی وطن تھا"

یہ ساری عبارت ایسی الجھی ہوئی ہے کہ اس سے کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتے، فرماتے ہیں عمید کا آبائی وطن تومک ہے جو کابل اور زاہدان کے بیچ میں ہے، (واضح رہے کہ ان دونوں شہروں کے درمیان کئی سو میل کا فاصلہ ہے، ایک وسط افغانستان میں اور دوسرا جنوب مشرق ایران میں پاکستان کی مغربی سرحد کے نزدیک واقع ہے) اس کے بعد کلیات بدر اور عمید کے ساتھ ساتھ نقل ہونے کے امکان کا غیر ضروری اور بے محل ذکر ہے، پھر تومسک کے بجاے کاتبوں کے قلم سے تومک لکھے جانے کے امکان کا بیان ہے، پھر دفعۃً کوکی (تاشکندی) کا ذکر آگیا، ازاں بعد پھر عمید کی تولکی نسبت کا ذکر ہے جو بظاہر زیادہ قرین قیاس نہیں، پھر عمید کی مازندرانی نسبت کے تعلق سے ایک بیت کا ذکر ہے، (مازندران کو رستم کا ملک بتایا ہے، حالانکہ رستم سیستانی و زابلی تھا، مازندران پر حملہ کرکے دیووں کو زیر کیا تھا، اسی غرض سے وہاں اس کا قیام رہا، اسی اعتبار سے شعر میں مقامگاہ کہا گیا ہے) آخر میں تومسک کو عمید کا وطن قرار دیے جانے کا فیصلہ کیا ہے، جس کا جائے وقوع روس میں ہے، مگر یہ فیصلہ کسی ماخذ کے ذکر کے بغیر ہے،

علاوہ بریں فلکا بزیر سقفت الخ والی بیت کا پہلا مصرعہ وزن سے خارج ہے، اس میں عمید سے پہلے "چو" کا لفظ درج ہونے سے رہ گیا، دوسرے مصرعے میں "مشہد" کے بجاے "نہہد" اور "ز جنس" کے بجاے "ز جنیں" ہونا چاہیے، اصل مخطوطے میں لویکی ہے جس کو فاضل مضمون نگار نے تولکی پڑھا ہے، یہی نسبت ایک اور بیت میں اس طرح پائی جاتی ہے:

عذر بزیر خطا بندہ عمید لویکی بر ورقست عذر خواہ از حشرات پر خطر

عمید کی دوسری بیت "مقامگاہ رستم الخ" سے عمید کے وطن مازندران کا قیاس کرنا محض فضول ہے، یہ شعر عمید کے ایک قصیدے کی تشبیب سے ماخوذ ہے جس میں باوجود علم و فضل کی زمانے کی ناقدری کے ہاتھوں اپنی زبوں حالی کا نقشہ کھینچا ہے، اس سلسلے کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں، جس سے بات پوری طرح واضح ہو جائے گی:

چہ دہد مرا زمانہ بکف از جہانہ نغم بہ بساط بزم گیتی قدح ستم دمادم

چہ کشتم ز دور گردوں چو قرابہ سر بہ لت بدل گلاب شادی ہمہ عمر بادۂ غم

بامید نقد گنجی بنہد دم بکام افعی زپی کباب گوری بدہد دم بچنگ ضیغم

فلک ار نہ بر خم سر آتیں نہ برزد — ز شفق چراست آنگہ سر آستینش معلم

دل جاں تحقیق حکمت ز سپہر ناتواں شد — دم جانفزاش ناید ز لب مسیح مریم

کف من ز شاخ طوبیٰ چو بریدہ گشت مانده — ز پل صراط حرماں نظرم سوی جہنم

جشن اگر فتہ ہمہ دار ملک کسریٰ — وطنی گزیدہ اکنوں بمقام گاہ رستم

ز حوادث زمانہ شدہ تیرہ جام خسرو — بامید ملک بردہ کف دیو خاتم جم

دل کیست آنکہ اینجا ز نہان مہر حکمت — کہ بدیو نقل چوں شد ز جمش نگین خاتم

چمن بہار ہمت بخزاں دمی رسیدہ — ز نوا بماندہ بلبل ز حدیث طوطی ابکم

ز در مدیح مفتن بہزار گونہ صنعت — نہ بدو لتم زیادت نہ ز نخلم جوی کم

اب ذرا عمید کی وطنی نسبت لویکی، توسکی، توکی، کوکی، قوبکی وغیرہ کی حقیقت سنئے!

ان سب میں توسکی جو فاضل مضمون نگار کے نزدیک سب سے زیادہ صحیح صورت ہے، سب سے زیادہ مہمل اور لغو ہے، اس لئے کہ عمید کے ان اشعار میں جن میں نسبت درج ہے، "توسکی" کے شمول سے مصرعے وزن سے خارج ہو جاتے ہیں مثلاً دیکھئے:

فلکا بزیر سقفت چو عمید توسکی کس — یا — یا عذر پذیر منما بندہ عمید توسکی

اگر کسی شخص کے سامنے یہ مصرعے نہ ہوتے اور وہ توسکی یا اسی وزن کا دوسرا لفظ درج کرتا تو قابل درگذر ہوتا، لیکن جس شخص کے پیش نظر دیوان ہو اور وہ "توسکی" کی نسبت کو صحیح قرار دیتا ہو تو اس کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے، کہ وزن کا ان کو کوئی شعور نہیں،

در اصل لویکی نسبت درست ہے، لیکن یہ وطنی نسبت نہیں، بلکہ نسبت جسی ہے، جس قصیدے سے ڈاکٹر نور السعید صاحب نے فلکا بزیر سقفت والی بیت درج

کی ہے، اس سے فوراً پہلے ایک بیت موجود ہے، جس سے اس سلسلے کی ساری بحث ختم ہو جاتی ہے، وہ بیت یہ ہے،

نسب از عمر پذیرم حسب از تبار لویک — بکدام سلک دیدی دو گہر چنیں منظم

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ عمید کا نسبی تعلق حضرت عمرؓ سے تھا، اور اس کا خانوادہ لویک نام کا تھا جو شاید کوئی مقامی قبیلہ رہا ہو، اس طرح اس کا پورا نام اس طرح قرار پاتا ہے،

"فخر الملک فضل اللہ عمید لویکی فاروقی سنامی"

لویکی نسبت چند اور جگہ دیوان میں موجود ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے فاروقی ہونے کا ذکر بھی کئی جگہ کرتا ہے، مثلاً

نسیم چو صبح صادق از دوم خلیفہ ثابت — کہ بخطبہ "انجیل" زد سوی ساری از کمینش

ظلم چہ می کند جہاں بر چوں منی کہ نسبتم — شمع فروز تا ابد ہست ز دودۂ عمر،

ص ۴۵۹ پر ہے:-

من اندر شست این صد و یک بیت بستم — ز بعد شصد و پنجاہ ہشت از فضل ربانی

یہ بیت دوبارہ ص ۴۶۱ پر اسی طرح نقل ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید مضمون نگار نے اسی طرح لکھا ہو، بہر حال پہلا مصرعہ وزن سے خارج ہے، در اصل لفظ خانہ شست سے پہلے درج ہونے سے رہ گیا ہے شصد کتابت کی غلطی ہے، صحیح لفظ شصد ہے،

ص ۷۰ پر ہے:-

در بدر شاشی (تاشقندی) نے ایک قصیدہ میں اس حقیقت کا اعلان

کا معاصر ہوتا اور اس کے دربار میں دیوان رسالت پر مشرف ہونا اعتراف
کیا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

فخار آل سری خواجۂ عمید شرف   وزیر راد شہنشاہ بن شاہنشاہ

اس بیت کے متعلق لکھ چکا ہوں کہ یہ ازرقی ہروی کی ہے، بدر چاچ سے اس کا
دور و نزدیک کا کوئی تعلق نہیں، مزید برآں اس کا ممدوح ابو الحسن علی بن محمد ہے
جو عمید لویکی سے ایک صدی سے زیادہ پہلے گذر چکا ہے،

ص ۶۱۳ پر ہے:۔

"راقم الحروف کا خیال ہے کہ ۶۵۸ میں عمید قید سے رہا ہوئے، مندرجۂ ذیل
شعر میں لفظ "بعد" سے ہماری توجہ اسی طرح مرکوز ہوتی ہے:۔

من اندر خانۂ حبست این صد یک بیت بر بستم   ز بعد ششصد و پنجاہ و ہشت از فضل یزدانی

یہ مسلم ہے کہ عمید سلطان نصیر الدین محمد پسر بلبن کے حکم سے قید ہوا تھا، ان کا
قصیدے میں جس کی ردیف "بند" ہے اس سے رہائی کا متمنی ہے، عام خیال ہے کہ یہ
شہزادہ محمد قاآن ہے جو ۶۸۳ میں منگولوں کے ہاتھ ملتان میں مارا گیا، اگر یہ بیان
صحیح ہے تو ۶۵۸ میں قید سے رہائی کا خیال درست نہیں ہو سکتا ہے، اس لئے کہ اس
شہزادہ کی سیاسی زندگی ۶۶۳ سے شروع ہوتی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ عمید کے حبس کا
واقعہ ۶۶۳ھ کے بعد کا ہوگا، قطع نظر اس کے "لفظ بعد" سے قید سے رہائی کا خیال لغو ہے، دراصل
"بعد" سے یہ مراد ہے، کہ یہ قصیدہ ۶۵۸ کے کچھ بعد لکھا گیا، جب کہ عمید کی عمر ساٹھ سال
کے حدود میں جا رہی تھی، (ساٹھ ول خانے میں یعنی پچاس سے ساٹھ کے درمیان)
۶۰۱ میں اس کی پیدائش مسلم ہے، ۶۵۸ کے کچھ بعد یہ قصیدہ لکھا گیا، گویا اس وقت

اس کی عمر ۷۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی،

ص ۶۲۴ پر ہے:۔

"راقم نے عمید کا ایک ایسا شعر پیش کیا ہے، جس کے مطابق عمید کا ۶۵۸
تک زندہ رہنے کا داخلی ثبوت ملتا ہے:

اس بیان میں کوئی غلطی نہیں، البتہ ایک کمی یہ ہے کہ دیوان میں ایسے کئی شعر
موجود ہیں جن سے ۶۵۸ ہجری کے کافی بعد تک عمید کے زندہ رہنے کا پتا چلتا ہے،
مثلاً حسب ذیل بیت میں ساٹھ سالہ عمر سے زیادہ ہونے کا ذکر اس طرح کرتا ہے،

گذشت عمر بغفلت ز شصت و نگر شد   برون حرص و امل وقت بس تنگ دارم

حسب ذیل بیت میں اپنی باسٹھ سالہ عمر کا ذکر کرتا ہے:۔

دو ہزار فتنہ خرد از غواشی خواندہ   بیان سال و عمر دو فزون ز شصت ادیم

اس بیت سے ظاہر ہے کہ اس وقت عمید کی عمر ساٹھ سال سے کافی زیادہ
ہو چکی تھی:۔

بدو کون جلوہ کردہ بہ ثنائے مصطفی میں   سخن گذشت ششصد و پس شصت واندادیم

جنوری ۱۹۷۶ء کے معارف کے ص ۴۵ پر ہے،

"عہد تغلق کے ملک الشعراء، فخر الزمان بدر الدین بدر شاسی عمید کی عظمت
کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں،

ایا بزرگ عمیدی کہ ارمغانی خوب   عروس نظم پذیرد ز مدح تو زیور

ارمغانی کی جگہ ازمعانی ہونا چاہئے، اس قول میں دو غلطیاں ہیں، جیسا شروع
میں عرض کیا جا چکا ہے، یہ شعر بدر شاشی کا نہیں بلکہ ازرقی ہروی کے ایک قصیدہ

سے ماخوذ ہے، دوسری غلطی یہ ہے کہ اس قصیدے کا مخاطب عمید لویکی نہیں بلکہ ابوالحسن علی ابن محمد ہے، اور ممدوح کا نام واضح طور پر قصیدہ میں موجود ہے، لیکن نہ معلوم کس غلط فہمی کی بنا پر مضمون نگار نے اس کا مخاطب فضل اللہ عمید لویکی قرار دیا ہے،

مضمون کے اس شمارے میں چونکہ عمید کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالی ہے تاریخی امور پر گفتگو نہیں ہوئی ہے، اس لئے اب کوئی خاص بات لکھنے کی نہیں البتہ اشعار جو نقل ہوئے ہیں، اکثر نہ صرف غلط بلکہ وزن سے خارج ہیں، البتہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں کتابت کی غلطیاں کس قدر ہیں، بہرحال ذیل میں غلط اشعار کی تصحیح کر دی جاتی ہے:

	مطبوعہ شکل	تصحیح شدہ صورت
ص ۵۵	بہ وقت شیوۂ تجنیس در رسم تضمین شد	بوقت شیوۂ تجنیس الخ (بظاہر کتابت کی غلطی)
"	بخجم نعت عمید است کنوں بگوی یادا	بخجم نعت عمیدت کنوں بگوی کہ یادا
"		(ایک بار اور اسی طرح نقل ہے)
"	خلعت خاص زعت (زازل) ایماشد	خلعت خاص بزینت زازل بیان شد
"	مبادا یادت از خاطر خرامست	مبادا یادت از خاطر فرامشت
ص ۶۲	مثل عمید تو سخن نادرو دوران درزمین	مثل عمید تر سخن نادر دوران زمین
ص ۶۳	از غزلم چہ فائدہ یار چو مست ہمنفس مدح چہ بہ دہد کہ شد نقش مراد گور دگر	از غزلم چہ فائدہ یار چو نیست ہمنفس ...... نقش مراد کو رو کہ
ص ۶۵	قامت دا پیہ (رستہ) نیاز خفتہ در بانی براف از تب افگند بدخواہ تو از خنجر پد (ـــ)	قامت نہ سر نیاز چفتہ در پای براق الخ (بظاہر کتابت کی غلطی) بدخواہ ترا نہ خنجر بید

	مطبوعہ شکل	تصحیح شدہ صورت
	چوں پہلو انار سینہ کفتہ	چوں پہلو نار سیدہ کفتہ
	دریاب عمید کہ بی تو	دریاب عمید را الخ
	درروز غمان دولت	در آرزوی غمان دولت
ص ۷۰	یکی جمعی........	یکی جمعی کہ روز و شب نیارد جز پشیمانی
ص ۷۱	فگندم خامۂ مدح و غزل از مہ بست کزبری	فگندم خامۂ مدح و غزل از دست کز پیری
	شدم چوں خانہ باریک در حریم ضعف نالانی	شدم چوں خامۂ باریک در حریم ضعف و نالانی
	من اندر نشست ایں صد و یک بیت برسم	من اندر خانہ نشست الخ
	زبعد شصد و پنجاہ و ہشت ز فضل ربانی	زبعد ششصد... از فضل ربانی
	خدا... و آں از لا الہ الا اللہ	جدا گمرہان از لا الہ الا اللہ
	عزا و ہم بلب طوطیان شکر خای	عزا و ہم الخ
ص ۷۲	ہر قدمی کہ زیں گذشت آں ز ضمیر باد خک	.... باد حک
	در سینہ ام کہ معدن صدف ہست وجای بند	در سینہ ام کہ معدن صدق است وجای پند
	در شہر از بگوی قناعتش ،	در شہر بند آز بگوی قناعتش
	برخیز عمید از فردست دل تو	برخیز عمید از نہ فسرداست دل تو
	مداحی درگاہ کسی کن بہ افراشت	مداحی درگاہ کسی کن کہ بر افراشت
	نطاق صنعہ مشرق بنطع چرخ چو بندق	نطاق صفحۂ مشرق... چو بیدق
	ز درج طبع بیار ہست بسی جواہر حکمت	ز درج طبع بیارت الخ
	ثنا و نعت پیامبر رسول خالق مطلق	ثنا و نعت پیمبر الخ
	کہ از برای قدرم نیست کیں قصیدۂ غرا	گزیر زاں قدرم نیست کیں قصیدۂ غرا

بگذرد جملہ مقفی چو از قوافی معلق	بگذرد جملہ مقفی من از قوافی مغلق
بختم نعت عمید است کنوں بگوی الخ	بخت نعت عمیدت الخ
ص ۲۳ قیمت گوہر سخن وقت و کنوں مزد کہ جز	قیمت گوہر سخت وقت کنوں مزد لکن
مہر سکوت بر نہم بر سر حصہ گوہر	مہر سکوت بر نہم بر سر حقۂ گہر
ص ۲۴ بر ز فر عمار یشش تا ز بیل	بر کر گدن ز فر عماریش تا ز بیل
چندیں ہزار بندہ جنس ایاز بیل	چندیں ہزار بندہ ز جنس ایاز بیل
در مصدر دماغ من افتاد شور و جنگ	در مصدر دماغ من افتاد شور و جنگ

راقم کو ان سطور کے لکھنے میں بڑا تامل تھا، اس لئے کہ اندیشہ تھا کہ کہیں ان سے ایک ہونہار نوجوان دوست کی حوصلہ شکنی نہ ہو، لیکن "دیوان عمید" طباعت کے لئے جارہا ہے، اور اس کے مقدمے میں جو باتیں عرض کی گئی ہیں، ان کی بابت مضامین زیر بحث سے غلط فہمیاں پیدا ہو جاتیں، اس بنا پر ان کا ازالہ ضروری قرار پایا۔

بزم مملوکیہ

ہندوستان کے غلام سلاطین اور ان کے دور کے علماء و فضلاء و شعرائ کے علمی و ادبی کارناموں پر نقد و تبصرہ، خصوصاً اس دور کے ممتاز اور سرآمد روزگار شعراء، ریزہ، شہاب اور عمید کا تعارف اور ان کے کلام کا انتخاب،

مولفہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن ۱۰۰۵ ناظم دار المصنفین اعظم گڈھ،

"منیجر"

پاکستان میں چار مہینے

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۳)

بیدل اکیڈمی میں جلسے

۷ ستمبر ۱۹۶۵ء کو جناب سید معز الحسن صاحب اعزازی سکریٹری بیدل اکیڈمی اور اس کے اراکین نے اکیڈمی میں مدعو کیا، یہ شرف آباد سوسائٹی میں ہے، جہاں زیادہ تر بہار اور یو۔ پی کے مہاجر رہتے ہیں، کچھ پنجابی اور میمن بھی ہیں، بہار کے فردوسیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کی یاد میں یہ کالونی آباد کی گئی ہے، اس کے رہنے والوں نے یہاں اپنے ہی سرمایہ سے ایک بہت بڑی عمارت بنوائی ہے، جس میں ایک شاندار ہال کے علاوہ اوپر نیچے کچھ کمرے ہیں، اس کا نام شرف آباد کلب رکھا ہے، اس کے بڑے ہال میں شادی بیاہ اور اہم جلسوں کی تقریبات بھی ہوا کرتی ہیں، جس سے اس کو اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے، اس کے بالاخانہ پر مغلیہ دور کے مشہور شاعر عبد القادر بیدل عظیم آبادی کے نام پر بیدل اکیڈمی قائم کی گئی ہے، یہ خیال تھا کہ یہاں پہنچ کر کچھ لوگوں سے مل کر علمی و ادبی گفتگو ہوگی، مگر وہاں شام کو پہنچا تو دیکھا کہ ہال روشنی سے جگمگا رہا ہے، اور کئی سو مدعوئین کے بیٹھنے کا انتظام تھا جن کو مجھے مخاطب کرنا تھا، اس رسمی استقبال کے لئے تیار نہیں آیا تھا، پہلے تو بیدل اکیڈمی کے کتب خانہ میں لے جایا گیا، جو ابھی بہت بڑا نہ تھا، مگر سلیقہ سے الماریوں میں کتابیں رکھی ہوئی تھیں، ایک شوکیس میں بیدل کے کلام اور رقعات کی چار

جلدیں دیکھیں، جو بہت ہی عمدہ چھپی ہوئی تھیں، ان کو دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور دکھ بھی، خوشی
اس لئے کہ ہندوستان کے ایک شاعر کی عظمت کا اثر ایک بیرونی ملک میں دکھائی دیا، مگر دکھ یہ تھا،
کہ اس ہندوستانی شاعر کو یہاں نظر انداز کیا گیا، تب ہی تو اس کی تصانیف یہاں چھپنے کے بجائے
باہر چھپیں، ان تصانیف کے ساتھ ڈاکٹر عبدالغنی کی کتاب نقد بیدل دیکھی جو فارسی میں ان کے
پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے، یہ ڈگری ان کو کراچی یونیورسٹی سے ملی ہے، اس سے اس برصغیر میں
بیدل کی ناقدردانی کی کچھ تلافی ہو گئی ہے، اب بیدل اکیڈمی ہی سے امید کی جا سکتی ہے کہ اس کے
ذریعہ سے بیدل کو اس برصغیر میں وہ اعلیٰ مقام حاصل ہو سکے گا، جس کے وہ واقعی مستحق ہیں،

بیدل اکیڈمی کے کمرے سے نکل کر ہال میں آیا تو مدعوئین میں بہت سے معززین سے تعارف
ہوا، کراچی یونیورسٹی کے ڈاکٹر شیخ الاسلام (صدر شعبۂ فارسی) پروفیسر جمیل اختر خاں، ڈاکٹر ریاض الحسن
ڈاکٹر سید مجتبیٰ رضوی (شعبۂ اردو، وہاں آئے ہوئے تھے)، ڈاکٹر معز الدین، ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی
بھی اپنے خصوصی مہمان جناب عرشی امرت سری کے ساتھ موجود تھے، ان کے علاوہ مولانا حکیم
احمد اللہ ندوی سابق رکن دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن، مولانا اسد القادری (صدر مجلس علمائے اسلام)
جناب انعام اللہ خان صاحب (سکریٹری جنرل موتمر عالم اسلامی مرکز) جناب خالد اکرام اللہ (جوائنٹ
سکریٹری جنرل موتمر اسلامی مرکز) مولانا اعجاز الحق قدوسی (مصنف صوفیائے پاکستان) جناب
محمود سکندر صاحب، انیس صاحب، پروفیسر فخر الحسن، جناب حسن صاحب بار ایٹ لا، جناب صبیح محسن
ایڈیٹر آہنگ، ریڈیو پاکستان اور حاجی عبدالخالق صاحب سے بھی تعارف ہوا، یہاں غالب کی کے [illegible]
ساتھیوں میں انوار حسن صاحب، اور جناب شرف الدین عظیم آبادی سے بھی ملاقات ہوئی، مولانا
حسن مثنیٰ ندوی اور سید ظفر الحسن صاحب جلسہ میں پیش پیش تھے، اس کی صدارت ڈاکٹر معین الحق
جنرل سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے کی، اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر معز الدین نے پہلے

اقبال اور بیدل کے عنوان سے ایک اچھا مقالہ پڑھا، پھر مولانا حسن مثنیٰ ندوی نے حاضرین سے میرا
تعارف کراتے ہوئے میری ساری تصانیف کے نام گن دیئے، علامہ شبلی، استاذی المحترم مولانا
سید سلیمان ندوی، اور دار المصنفین کے شاندار کارناموں کی تفصیل بتائی، پھر مولانا اسد القادری نے
اس خصوصی لگاؤ کا ذکر کیا، جو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی اس حقیر سے رکھتے تھے، ان کی
آواز بڑی گرجتی ہوئی تھی، شان خطابت بھی موجود تھی، جس سے جلسہ کے حاضرین گویا جاگ اٹھے،

میری تقریر کا کوئی خاص موضوع مقرر نہیں کیا گیا تھا، اس لئے میں نے طے کیا کہ شرف آباد
سوسائٹی کے شرف آباد کلب میں ہوں تو پہلے حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کے فیوض
و برکات پر کچھ اظہار خیال کروں، تو بے جا نہ ہوگا، پھر اسی میں بیدل اکیڈمی ہے، تو بیدل
عظیم آبادی سے متعلق میری جو کچھ معلومات ہیں ان کو پیش کروں،

حضرت شرف الدین یحییٰ منیری سے بڑی قلبی عقیدت ہے، بزم صوفیہ میں ان پر ایک
باب لکھنے کے سلسلہ میں ان کی ساری تصانیف کے مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا، اس لئے ان کی
زندگی کے سارے جلوے، اور ان کی صوفیانہ تعلیمات کے سارے رموز و نکات ذہن کے سامنے
آگئے، ان ہی کے فیوض سے اس وقت زبان میں قوت گویائی آگئی، اور ان کے کارناموں پر
دیر تک بولتا رہا، اسی سلسلہ میں یہ عرض کیا کہ بہار کے حضرت شرف الدین یحییٰ منیری اور سندھ
کے حضرت جلال الدین جہانیاں جہاں گشت میں بڑے خوشگوار تعلقات تھے، جن سے یہاں کے
مہاجرین اور سندھی دونوں سبق لے سکتے ہیں، حضرت جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشت
کے پاس حضرت شرف الدین یحییٰ منیری نے ایک کفش بھیجی، جس کا مطلب یہ تھا کہ میں آپ کا کفش بردار
ہوں، لیکن حضرت جلال الدین بخاری نے اس کے بدلہ میں اپنی دستار بھیجی جس سے یہ مراد تھی،
کہ آپ میرے سرتاج ہیں، اس واقعہ کا ذکر کر کے یہ کہا کہ خدا کرے بہاریوں اور سندھیوں

میں بھی مخلصانہ تعلقات پیدا ہو جائیں، ایک اگر اپنے کو دوسرے کا نقش پا سمجھے تو دوسرا اس کو اپنا سرتاج بنائے۔

بیدل عظیم آبادی پر بھی اپنے کچھ خیالات کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ تذکرہ نگاروں میں میرزا افضل نے ان کے بارہ میں لکھا ہے کہ

"استاد فن است، بسیار گو و خوب گو است، امروز در دار الخلافت کوس سخن سنجی می نوازد و داد سخنوری و خوش خیالی می دہد"

مراۃ الخیال کے مولف شیر خاں لودی نے لکھا ہے:

"زلال فکرش در صدف گوشہا نیسانی می کند و سحاب سخنش در چمن خاطر ہا باغبانی می نماید"

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ

"عمدۂ سخن طرازان و شہرۂ سحر پردازان است، در اقسام نظم پایۂ بلند و در اسالیب نثر رتبہ ارجمند دارد"

غالب کو بھی ان کا انداز بیان شروع میں پسند تھا، مگر انھوں نے اس کا بھی اعتراف کیا کہ

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے،

پھر بیدل کے کلام میں وحدۃ الوجود کا جو فلسفہ ہے اس پر اظہار خیال کیا، اور اس کی وضاحت کی کہ اگر وحدت الوجود کا مطالعہ صحیح طور پر کیا جائے، تو اس میں اسلام کے عقائد کے خلاف کوئی چیز نظر نہیں آئے گی، البتہ بگڑے ہوئے وحدت الوجود میں اسلامی عقائد نظر نہیں آئیں گے،

میری تقریر کے بعد جائے پر کثرت سے مدعوین تھے، بیدل اکیڈمی کی یہ صدر سندی

قابل تعریف ضرور تھی، مگر اتنی فیاضی کی بھی ضرورت نہ تھی، اس موقع پر تحفے میں بہت سی کتابیں ملیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں،

۱۔ تذکرہ مسلم شعرائے بہار: یہ چھ جلدوں پر مشتمل ہے، اس کے مرتب حکیم سید احمد اللہ ندوی ہیں، جو دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن عرصۂ دراز تک رہے، ان کا آبائی وطن آب گلہ ضلع گیا ہے، تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے گئے، جہاں جامعہ طبیہ شرقیہ کراچی میں استاد بھی رہے، ندوی ہونے کی وجہ سے دار المصنفین کے بڑے قدرداں ہیں، کبر سنی اور صحت کی خرابی کی وجہ سے بہت نحیف اور کمزور ہو گئے ہیں، لیکن دار المصنفین کی محبت میں تکلیف اٹھا کر مجھ سے ملنے کے لئے اس جلسہ میں شرکت کی، اور اپنی یہ چھ جلدیں عنایت کیں، ان کو پڑھنے کے بعد حیرت ہوئی کہ جو کام کسی سے نہ ہو سکا تھا، انھوں نے انجام دے کر پست ہمت علمی نوجوانوں کو اپنی محنت شاقہ اور ریاضت کا نمونہ دکھا کر ان کو عبرت دلائی ہے، شروع میں ان کا ایک پر مغز مقدمہ بھی ہے، جس سے اندازہ ہوا کہ وہ اس تذکرہ کی تالیف میں ۱۹۳۶ء سے پہلے ہی سے مواد جمع کرتے رہے، اور محنت شاقہ کے بعد اس کو ۱۹۶۶ء میں مکمل کیا، اس میں بہار کے تقریباً سات سو قدیم و جدید شعراء کے کچھ حالات اور ان کے کلام کے نمونے ہیں، ان کو بہار کے قدیم ترین شعراء کے کلام کی تلاش میں بھی کامیابی ہوئی ہے، جس سے اس صوبہ میں اردو شاعری کے ارتقاء کے مطالعہ میں بڑی مدد ملے گی، مثلاً حضرت شاہ عماد الدین عماد پھلواروی (متولد ۱۰۶۵ھ) بانی و سجادہ نشین خانقاہ عمادیہ کے یہ اشعار نقل کئے ہیں،

ایچ نظر کے ایدھر اودھر ہر دم آوے جاوے ہے،
بل بے ظالم تس پر ٹک دیکھے کو ترساوے ہے

آوے اپنے ہاتھ وہ مورکھ نہیں عماد اب اس کی آس
اس کے کارن کون جتن ہم کیا جو نہیں آوے ہے

جب ستی چھوڑ بن کھانا پینا ترا دوانہ الفت میں

خون جگر کا پیوے ہے اور غم غصہ کو کھاوے ہے

وہ ولی گجراتی کے ہم عصر تھے، شاعری کی زبان میں کچھ ترقی ہوئی تو حضرت عماد کے صاحبزادے شاہ غلام نقشبند سجاد کا انداز یہ ہوگیا،

ہوا جانے سجاد ہے جن کے غم میں وہ شکلیں نگاہوں میں کیوں آتیاں ہیں

مگر رفتہ رفتہ اس صوبہ میں زبان صاف ہوتی گئی، راسخ عظیم آبادی (المتوفی ۱۲۳۸ھ) کے اشعار کے یہ نمونے ہیں،

کیا بیاں ہو صاحبان ظرف کی تاثیر قرب

آب کا قطرہ صدف تک آن کر گوہر ہوا

خدا جانے نہاں اس آشکارا میں ہے کیا کیا کچھ

خوشا وے اہل دل جس پر نہاں بھی آشکارا ہے

پھر تو شاد عظیم آبادی نے ایک بلند معیار قائم کرکے اپنے فن کی مہارت دہلی اور لکھنؤ والوں سے بھی تسلیم کرالی، فاضل مؤلف نے بہار کے اساتذۂ فن میں راسخ عظیم آبادی اور شاد عظیم آبادی کے علاوہ صفیر بلگرامی، راحت سہرامی، شوق نیموی، اکبر داناپوری، تمنا عمادی پھلواروی، شفق عماد پوری، عرش گیاوی، عشرت گیاوی، حشر ایٹھوی، رسا گیاوی، سرور کابری، بدر آروی، کیفی بہاری، اور رکن بہاری کے نام لئے ہیں، مگر تعجب ہے کہ اس فہرست میں امداد امام اثر کا اسم گرامی نہیں ہے؛ مؤلف نے جن تذکروں سے استفادہ کیا ہے، وہ اُن کے لئے مفید ماخذ بن سکتے ہیں، جو اردو کی تذکرہ نگاری سے دلچسپی رکھتے ہیں، بعض مشہور تذکروں کے علاوہ سلطان عظیم آبادی کی مرقع فیض، جناب منشی جگیشر پرشاد خلش گیاوی، تمنیۂ خواجہ عشرت لکھنوی کی فروغ بزم

معروف بہ تذکرۂ شعرائے صوبہ بہار، سید عزیز الدین بلخی کی تاریخ شعرائے بہار قیس سعید آبادی گیاوی کی گلشن حیات وغیرہ ایسی کتابیں ہیں جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوسکے گا کہ بہار کے ارباب ذوق نے اپنے صوبہ کے شعراء کو زندہ رکھنے میں کوشش کی، اور جو کمی رہ گئی تھی، وہ مسلم شعرائے بہار کی چھ جلدوں سے پوری ہوگئی، ان میں انداز بیان ایک تذکرہ نگاری کا ہے، مگر یہ اس لئے قابل قدر ہے کہ جو شعراء بھلا دیئے جاچکے تھے، وہ بھی ان جلدوں میں زندہ کردیئے گئے ہیں، اور جو کام بہار کی سرزمین میں ہونا چاہئے تھا، وہ کراچی میں انجام پایا، یہ جلدیں آگے چل کر بہت ہی مفید ماخذ بن جائیں گی، اس لئے فاضل معمر مؤلف کا یہ ادبی کارنامہ پوری تعریف کا مستحق ہے، امید ہے کہ نہ صرف بہار کے اہل علم بلکہ اردو شاعری سے ذوق رکھنے والے اُن کی اس محنت شفقت کو ضرور قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے تمام جلدوں کی قیمت زیادہ نہیں، صرف تیس روپے ہیں، مؤلف کا پتہ یہ ہے: پیر الٰہی بخش کالونی کوارٹر نمبر ۹۵ م کراچی نمبر ۵،

مولانا سید احمد اللہ ندوی نے اپنی ایک اور تصنیف تاریخ حدیث و محدثین کی دو جلدیں بھی دیں، کراچی کے قیام کے زمانہ میں ایک صاحب ان کو پڑھنے کے لئے لے گئے تو پھر واپس نہیں دئے گئے، اسی لئے ان دونوں جلدوں پر کچھ لکھنے سے قاصر ہوں، جس کے لئے مولانائے موصوف سے معذرت خواہ بھی ہوں،

۲- دیوانِ دل: اس کو بیدل اکیڈمی کے سکریٹری جناب ظفر الحسن صاحب نے ایڈٹ کیا ہے؛ وہ پاکستان کی مرکزی حکومت میں ملازم ہیں، مگر اپنے دفتر کے کاموں کے باوجود علمی سرگرمیوں میں برابر منہمک رہتے ہیں، دیوانِ دل کو ایڈٹ کرکے اپنے اچھے ادبی ذوق کا ثبوت دیا ہے، دل عظیم آبادی اردو کے مشہور شاعر اشرف علی فغاں کے معاصر تھے، ان کے والد بزرگوار جسونت رائے ناگر علی وردی خاں کے عہد میں ممتاز فوجی سردار تھے، ان کے دو بیٹوں نے اسلام قبول کرلیا، ایک محمد عارف جوشش عظیم آبادی اور دوسرے شیخ محمد عابد دل عظیم آبادی تھے۔ دل عظیم آبادی کا ذکر تمام اردو شعراء کے تمام تذکروں میں تھا،

مگر ان کا دیوان کہیں نہیں پایا جاتا تھا، بہار کے مشہور ادیب جناب سید وصی احمد بلگرامی کو اس کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا، اور اس کو بڑی محنت سے نقل کیا، اسی کو جناب ظفر الحسن نے سلیقہ سے ایڈٹ کر کے ایک اچھا ادبی تحفہ بنا دیا ہے، شروع میں ولی کے خاندانی حالات ہیں، پاکستان کے علمی و ادبی حلقہ میں یہ رواج ہو گیا ہے کہ جب کوئی کسی شاعر کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہے، تو تمام تذکروں میں اس کے متعلق جو کچھ ملتا ہے، ایک ساتھ جمع کر دیا جاتا ہے، اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس کا یکجائی مطالعہ کر کے قارئین کو خود بھی رائے قائم کرنے کا موقع مل جاتا ہے، زیر نظر کتاب میں ولی سے متعلق بھی یہی کیا گیا ہے، اس کے بعد ولی کے حالات جو کچھ معلوم ہو سکے وہ بیان کئے گئے ہیں، اُن کے ہم عصر شعراء کا بھی ذکر ایک علٰحدہ باب میں کیا گیا ہے، پھر اُن کی شاعری پر مفصل تبصرہ ہے، اس سلسلہ میں جوشش، فدوی اوروں کی ہم طرح غزلیں بھی نقل کر دی گئی ہیں، ولی کی غزلوں میں جو عجیب و غریب الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اُن کو جمع کر کے لغت کے ذریعہ سے اُن کی تصریح بھی کر دی گئی ہے، مثلاً واربار (بازی گر) سرسائی (جبیں سائی) بیکاسہ (کم ہمت، تنگ خواب (میٹھی نیند) گل چشم (آنکھ کی پتلی) مغبر (غبار آلود) مفت بر (مفت خور) تھوتھا (اندر سے خالی) لڑکائی (لڑکپن) ایک طویل باب میں ولی اور غالب کے ہم معنی اشعار نقل کئے گئے ہیں، جس سے لائق مرتب کی یہ مراد ہے کہ غالب کے مطالعہ میں ولی کا دیوان رہا، جس سے اثر پذیر ہوئے اور اس کا تتبع بھی کیا، یاس عظیم آبادی ثم یگانہ چنگیزی کے زمانہ میں یہ کتاب شائع ہوئی، تو شاید اپنے رسالہ غالب شکن میں کچھ اور اضافہ کر دیتے، مگر غالب کے پرستار کبھی یہ تسلیم نہیں کریں گے، کہ انھوں نے ولی کے کلام سے استفادہ کیا ہے، اور خود غالب بھی اس کا اعتراف کرنے کو تیار نہیں ہوتے، کیونکہ وہ تو یہ کہہ گئے ہیں، کہ اُن کی شاعری ہزار معنوں پر مشتمل ہے، جو اہل ذوق کے نزدیک شہد سے بھی بہتر ہے، اگر کہیں توارد ہو گیا ہے تو اس سے اُن کی غزل کی آرائش ختم نہیں ہو سکتی ہے، دوسروں کے لئے تو کسی شاعر کے خیال کی بلندی تک پہنچنا فخر کی بات ہے، لیکن اُن کے لئے یہ ننگ ہے، اور

پھر چڑھ کر یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ اگر اُن کے شعر میں توارد پیدا ہو گیا ہے تو اس کو چوری نہ سمجھا جائے، بلکہ اُن کے نہاں خانۂ دل میں جو چیز پوشیدہ تھی، اس کو دوسروں نے خود چرا لیا ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں، کہ شاعری کوئی چیک یا تمسک تو نہیں جس پر کسی خاص آدمی کا دستخط یا مہر یا نام ہو، یہ ایک نوٹ ہے، کہ جس کے ہاتھ میں آ جائے، اسی کی ملکیت ہے" اس بحث سے قطع نظر مجموعی حیثیت سے اس دیوان کا مقدمہ پر مغز ہے، جو محنت سے لکھا گیا ہے، اس کی اشاعت سے ایک اچھا ادبی اضافہ ہوا ہے، شروع میں دیوان سے متعلق سید وصی احمد بلگرامی کی ایک تحریر ہے، جو اپنے مخصوص انداز بیان کے لئے ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں،

۳۔ **تاریخ سندھ:** یہ پاکستان کے مشہور مصنف مولانا اعجاز الحق قدوسی کی لکھی ہوئی ہے، جنھوں نے اپنے قلم کی برق پاشی سے وہاں کے علمی حلقہ میں بڑا علمی امتیاز حاصل کیا ہے، شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مصنف ہونے کے علاوہ پنجاب، سندھ، سرحد، اور بنگال کے صوفیائے کرام پر مختلف جلدیں لکھی ہیں، جو وہاں بہت شوق سے پڑھی جاتی ہیں، اس سفر میں یہ بھی معلوم ہوا کہ انھوں نے تزک جہانگیری کا ترجمہ اردو میں کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے، یہ ترجمہ ٹائپ کے حروف میں بڑے اہتمام سے شائع ہوا ہے، اس کی ایک جھلک جناب سید حسام الدین راشدی صاحب کے کتب خانہ میں دیکھی، خیال تھا کہ ہندوستان واپس ہوں گا تو اس کو بھی ایک اچھے علمی تحفہ کے طور پر ساتھ لیتا آؤں گا، مگر ایسا نہ ہو سکا، مولانا اعجاز الحق قدوسی صاحب نے اپنی نئی تصنیف تاریخ سندھ بہت شوق سے پیش کی، اپنی قیام گاہ پر واپس آیا تو ایک عزیز اس کو پڑھنے کے لئے لے گئے، تو پھر اُن سے واپس نہیں ملی، اس لئے مولانا سے معذرت خواہ ہوں کہ میں خود اس کا مطالعہ نہ کر سکا،

۴۔ **دکنی زبان کی قواعد:** جلسہ ہی میں ایک صاحب مرزا ضیاء الدین بیگ نے بڑھ کر

میرے ہاتھ میں یہ کتاب دی، جو ڈاکٹر حبیب ضیاء ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی (عثمانیہ) کی تالیف ہے، مولف کا دعوی ہے کہ جو زبان دکنی کہلاتی ہے وہ اپنے لفظی سرمایے کے علاوہ قواعدی ساخت کی بعض خصوصیات میں بھی اس ہندوستانی سے مختلف ہے، جو شمالی ہند میں ارتقا کے مختلف منازل طے کرنے کے بعد اردو کہلائی، اسی کی قواعد مرتب کرنے میں انھوں نے پوری کاوش کی ہے، صرف ونحو کی اصطلاحات وہی ہیں جو فارسی اور اب اردو میں استعمال ہوتی ہیں، البتہ مثالیں پیش کرنے میں خواجہ بندہ نواز، محمد قلی قطب شاہ، نصرتی، وجہی، ہاشمی، غواصی، بحری، میران جی، وغیرہ کی تصانیف سے پوری مدد لی ہے، اس طرح مولف نے دکنی زبان کی قواعد مرتب کر کے ہندوستانی لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک مفید کتاب مرتب کر دی ہے جو امید ہے کہ دلچسپی سے مطالعہ کی جائے گی، مگر صرف ونحو کے اس ماہر کے قلم سے قواعدوں کا لکھا تعجب خیز معلوم ہوا، قاعدہ کی جمع تو قواعد ہے، جمع الجمع کو کیسے روا رکھا گیا ہے۔

(۵) ہمر نمروز۔ اس جلسہ میں ہمر نیمروز کے متعدد پرچے پیش کیے گئے، جو مولانا حسن مثنی ندوی کی ادارت میں نکلتا ہے، اس میں علمی، ادبی اور مذہبی مضامین شایع ہوا کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مولانا اپنی آمدنی کا زیادہ حصہ اسی کی ترتیب اور طباعت میں صرف کر دیتے ہیں، شادی نہیں کی ہے، علم و ادب ہی کو عروس بنا رکھا ہے، اس رسالہ کی بدولت نوجوان اہل قلم کی بڑی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے، جناب ظفر الحسن صاحب اور ان کی تعلیم یافتہ بیوی کو بھی اس رسالہ کے معیار کو برقرار رکھنے میں پوری دلچسپی ہے، مولانا حسن مثنی ندوی جب وہ باہر نکلتے ہیں تو ان کے جلو میں نوجوان اہل قلم ہوتے ہیں۔

کراچی اب تک استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے مزار اقدس پر حاضر نہ ہو سکا تھا، قصداً ارادہ ملتوی رکھا، اور طے کر لیا تھا کہ ایک خاص موقع پر حاضری ہوگی مگر غائبانہ آنکھیں ان کے مزار کو برابر دیکھتی رہیں، کراچی کی اہمیت میری نظروں میں اس لیے ہو گئی ہے کہ جوئے شیر اسلامیہ کا فرہاد یہیں ابدی نیند سو رہا ہے، جس نے اپنی پوری تصنیفی زندگی زبان، دل اور عمل کی سچائی، عفت، پاکبازی، شرم، حیا، رحم، عہد کی پابندی، رفق، لطف، تواضع، خاکساری، خوش کلامی، ایثار، خودداری، حق گوئی اور استغنا کی تعلیم دینے میں صرف کی، اس کی ابدی خوابگاہ کے شہر کو بھی اسی اسلامی اخلاق کا نمونہ ہونا چاہیے، مگر اس کے مختلف حصوں سے گزرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ اس پر اسلامی رنگ غالب ہونے کے بجائے فرنگی کیا بلکہ اینگلو انڈین کا تمدن غالب ہوتا جا رہا ہے، وہاں کے مشہور کالم نویس ز۔ اے۔ سلہری کا ایک مضمون جنگ اخبار میں نظر سے گذرا، جس میں انھوں نے اعتراف کیا کہ کراچی انگریزوں کی حکومت کے زمانہ میں فرنگی تمدن سے اتنا متاثر نہیں ہوا تھا، جتنا کہ اب ہو رہا ہے، مردوں کا لباس کوٹ یا بش شرٹ اور پتلون عام ہو چکا ہے، یہاں کے مزدور بھی اب یہی لباس پہننے لگے ہیں، شیروانی بالکل غائب ہو چکی ہے، کسی کے جسم پر یہ نظر آجاتی ہے تو سب کی نگاہیں اس پر اٹھتی ہیں، شکر ہے کہ عورتوں کے لباس میں فرنگیت نہیں پیدا ہوئی ہے وہ زیادہ تر ساریوں میں دکھائی دیتی ہیں، شلوار اور کرتے میں بھی نظر آئیں، میمن اور بوہری عورتوں کا لباس ساتر دیکھا، برقعہ پوش عورتیں کم دکھائی دیں، اب تو برقعہ کے بجائے لمبا کوٹ استعمال ہونے لگا ہے، دوپٹے کا رواج بالکل جاتا رہا، جلسوں میں عورتیں بے تکلف مردوں کے ساتھ بیٹھتی ہیں، پہلے کی طرح ان کی نشستوں کے لیے علحدہ جگہیں نہیں ہوتی ہیں، نوجوان اچھے سے اچھا لباس پہننے، اور سر کے بال کو سنوارنے میں دنیوی زندگی کی اصلی لذت محسوس کرتے ہیں،

مسجدیں جابجا ہیں، اور اچھی سی اچھی ہیں، مگر نماز کے وقت جتنے لوگ ان کے اندر ہوتے ہیں اس سے کہیں زیادہ باہر اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں، لوگوں کو پیسے بنانے کے پیچھے دوڑتے پایا، جو جتنا کچھ پاتا ہے، اس سے زیادہ حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے، عذر یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی گرانی میں اخراجات پورے نہیں ہوتے، اس تگ و دو بلکہ بھیڑ بھاڑ میں جب ناکامی یا مایوسی ہوتی ہے تو ایک دوسرے سے بدگمانی پیدا ہوتی رہتی ہے، جس کا اظہار مختلف شکلوں میں ہوتا رہتا ہے، توکل، قناعت پسندی اور شکر گذاری کا جذبہ کم ہوتا جا رہا ہے، اسی لئے پاکستان سے باہر جا کر بھی پیسے کمانے کی عام دھن ہے، پڑھے لکھے نوجوانوں کی نظر سعودی عرب، کویت، لیبیا، دوبائی، اور ایران وغیرہ کی طرف اٹھی رہتی ہے، جہاں تنخواہیں بہت ملتی ہیں، اب تو کسان اور مزدور بھی وہاں جانے لگے ہیں، ان ممالک کی کمائی سے پاکستان کے زرمبادلہ میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، کراچی کے مکانات دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون زیادہ اچھا ہے، ان کی شان دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان مسلمانوں کے پاس کہاں سے قارون کا خزانہ مل گیا ہے، ایک بہت ہی معتبر دوست نے بتایا کہ تقسیم سے پہلے سیٹھ عبد اللہ ہارون بہت بڑے بڑے سرمایہ دار سمجھے جاتے تھے، مگر بینک میں ان کا سرمایہ چند لاکھ سے زیادہ نہیں تھا، مگر اب کراچی میں کروڑوں کے سرمایہ رکھنے والے قابل توجہ نہیں سمجھے جاتے، اب تو بعض سرمایہ داروں کے پاس ارب اور کھرب سے بھی زیادہ کی دولت ہے، جس کا مظاہرہ سڑکوں پر ان کی موٹر گاڑیوں سے بھی ہوتا رہتا ہے، ہندوستان میں تو تین چار قسموں ہی کی موٹر گاڑیاں سڑکوں پر چلتی دکھائی دیتی ہیں، مگر کراچی کی سڑکوں پر ان کی قسموں کا گننا مشکل ہے، بعض گاڑیوں کی قیمت سن کر تو حیرت ہوئی، یہ سب باہر سے خرید کر منگائی جاتی ہیں، معلوم نہیں اس طرح غیر ملکی زرمبادلہ

کتنا صرف ہوتا ہوگا، گھروں کے اندر بھی معیار زندگی بہت کچھ بدل چکا ہے، چھوٹی تنخواہ کا ملازم بھی ایک ڈرائنگ روم، ایک ٹی-وی-سٹ، ایک ریفریجریٹر رکھنے کے لئے سرگرداں رہتا ہے، اگر یہ چیزیں اس کے یہاں نہیں ہوتی ہیں تو اس پر زندگی کی مایوسی طاری رہتی ہے، جس کے پاس یہ چیزیں ہوتی ہیں، وہ ان کی افادیت پر گفتگو کرنے کو تیار رہتا ہے، ایک بڑی تنخواہ پانے والے ملازم نے مجھ سے کہا کہ میں پاکستان کی خوشحالی دیکھ کر ضرور خوش ہوا ہونگا، میں نے جواب دیا کہ یہاں خوش حال مسلمان کے بجائے سچے اور اچھے مسلمان دیکھتا تو زیادہ خوش ہوتا، خوش حالی کے ساتھ اعلیٰ کردار اور سیرت کی بھی تعمیر ہو تو ضرور قابل تعریف ہے، ورنہ یہ زندگی محض سراب زندگی ہے،

ولینہ ایسوسی ایشن میں ایک تقریر

میرے اعزہ اور سابق ہموطنوں کی وہاں کثیر تعداد ہوگئی ہے، وہ باہمی میل جول کے لیے ایک ماہانہ اجتماع کرتے ہیں، ۲ ستمبر ۱۹۷۵ء کو ان کا ایسا ہی ایک اجتماع تھا، تو اس میں مجھ کو بھی مدعو کیا، وہاں بھی ایک تقریر کرنی پڑی، جس کا لب لباب یہ تھا کہ یہاں وہ مہاجر بن کر آئے ہیں، اگر وہ اچھے اور سچے مہاجر بن کر عرفان حیات، سوز معاشرت اور تب و تاب زندگی کے بلند نمونے پیش کرتے رہے، تو وہ ضرور یہاں خوش رہیں گے، موجودہ دور میں فسق کو فسق، فجور کو فجور، اور معصیت کو معصیت کہنے والا مسلمان اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے، مگر یہ زمانہ ہی بتائے گا کہ کون معرفت زندگی حاصل کر رہا ہے، اور کون اس سے محروم ہوتا جا رہا ہے،

اسلام آباد

۹ ستمبر ۱۹۷۵ء کی شام کو مولانا کوثر نیازی وزیر امور مذہبی کی دعوت پر کراچی سے ہوائی جہاز پر اسلام آباد روانہ ہوا، رمضان شریف کا مقدس مہینہ شروع ہو چکا تھا، افطار کا سامان ہوائی جہاز ہی پر ملا، اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر جناب رحمت علی چودھری صاحب

ڈاکٹر ڈاف مجھکو لینے کے لیے آئے ہوئے تھے وہ مجھکو انٹر کونٹی نینٹل ہوٹل اپنے ساتھ لائے، جہاں میرے قیام کا انتظام کیا گیا تھا، ان سے باتیں شروع ہوئیں تو وہ دارالمصنفین کے بڑے قدر دان نکلے، اس کی بہت سی مطبوعات پڑھے ہوئے تھے، میری تمام تصانیف کے نام لینے لگے، اسی ہوٹل میں پہلے سے جناب یونس سعید صاحب سکریٹری نیشنل بک فاؤنڈیشن ٹھہرے ہوئے تھے، دوسرے دن جناب زاہد ملک صاحب جوائنٹ سکریٹری وزارت مذہبی امور مجھ سے ہوٹل میں ملنے آئے، اور پھر ہم اور وہ یونس سعید صاحب کے کمرے میں بیٹھ کر دارالمصنفین کے حق طباعت کے سلسلہ میں دیر تک گفتگو کرتے رہے، جناب یونس سعید صاحب اس حق طباعت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئے، بشرطیکہ ان کی وزارت تعلیم یہ حق خرید کر ان کے حوالے کر دے، جناب زاہد ملک صاحب بہت ہی ذہین سرکاری افسر ہیں، اسی کے ساتھ بہت ہی خلیق اور متواضع ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو وجیہ اور شکیل بھی بنایا ہے، اس معاملہ کو خوش اسلوبی سے طے کرنے کا پورا یقین دلایا، میں نے ان سے پھر کہا کہ آپ لوگ جو کچھ طے کریں گے اس کو میں اپنی حکومت کے سامنے پیش کروں گا، ہر حال میں اس کی منظوری ضروری ہے، اس ملاقات کے دوسرے دن، انھوں نے مولانا کوثر نیازی سے میری ملاقات کا وقت مقرر کرایا، اپنی گاڑی مجھکو لینے کے لیے بھیجی، راولپنڈی سے اسلام آباد پندرہ میل کے فاصلہ پر ہے، راستے میں پورا شہر دیکھا گیا، جو پہاڑی زمین کو مسطح کر کے آباد کیا گیا ہے، بڑی چوڑی سڑکیں نکالی گئی ہیں، جن کے دونوں طرف اونچی اونچی زمینیں چھوڑ دی گئی ہیں، ان پر تالی اور نیم کے درخت لگے ہوئے ہیں، جو دور سے دیکھنے میں بھلے معلوم ہوتے ہیں، ہر طرف سبزہ نظر آتا ہے، آبادی مسلسل نہیں ہے، پلاننگ میں گنجان آبادی کے بجائے بکھری آبادی کا خاص خیال رکھا گیا ہے، اس لئے کافی حصے چھوڑ کر مکانات یا سرکاری دفاتر یا کوارٹر بنائے گئے ہیں معلوم ہوا

کہ جنوری سے مارچ تک خالی جگہوں میں صرف پھول ہی پھول نظر آتے ہیں جس سے پورا شہر رنگین اور حسین ہو جاتا ہے، یہاں زیادہ تر یا تو دفاتر ہیں، یا سرکاری کوارٹر ہیں، یا سفارتخانے ہیں۔ وزارت امور مذہبی کے دفتر پہونچا، تو جناب زاہد ملک صاحب بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے کمرہ میں لے گئے، پھر اپنی وزارت کے اڈیشنل سکریٹری جناب مجتبیٰ حسین ہاشمی سے لے جا کر ملایا، وہاں سے واپس آکر مولانا کوثر نیازی سے ملنے کے انتظار میں جناب زاہد ملک صاحب کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ ان کا لڑکا داخل ہوا، جو شاید پانچ چھ برس کا ہوگا، وہ اس وقت کسی سے ٹیلیفون پر پنجابی میں گفتگو کر رہے تھے، ٹیلیفون رکھ کر اپنے چھوٹے لڑکے سے اردو میں باتیں کرنے لگے، مجھکو تعجب ہوا، ان سے کہا کہ ابھی تو آپ پنجابی میں گفتگو کر رہے تھے مگر اپنے لڑکے سے اردو میں باتیں کر رہے ہیں، کہنے لگے کہ وہ گھر میں اپنی بیوی سے تو پنجابی میں بولتے ہیں، مگر بچوں سے اردو ہی میں گفتگو کرتے ہیں کیونکہ وہ اردو اسکول میں پڑھتے ہیں، اب اردو ہی بولتے اور سمجھتے ہیں، ان کو پنجابی نہیں آتی

مولانا کوثر نیازی سے ملاقات

تھوڑی دیر کے بعد وہ مجھکو مولانا کوثر نیازی کے پاس لے گئے۔ ان کو پہلی دفعہ دیکھا تھا، وجیہ اور شکیل نظر آئے، داڑھی خشخشی تھی، گورے چٹے تھے، قدو قامت اور ضخامت میں پنجابی ہی معلوم ہوئے، اکاون باون سال کی عمر ہوگی، بہت اخلاق سے پیش آئے، پہلے تو جناب زاہد ملک صاحب نے مجھ سے دارالمصنفین کے حق طباعت کے فروخت کے سلسلہ میں جو گفتگو کی تھی، اس کو دہرایا، جس کو سن کر انھوں نے فرمایا کہ یہ کام ضرور ہو جانا چاہئے پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ انھوں نے اپنے وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو سے بھی اس مسئلہ پر گفتگو کر لی ہے، اور ان کا رویہ بھی ہمدردانہ ہے، پھر اس کے بعد وہ دارالمصنفین کی علمی سرگرمیوں پر گفتگو کرنے لگے، انھوں نے بتایا کہ معارف ان کے مطالعہ میں عرصہ دراز سے

اس کی تازہ اشاعت کے مضامین کا ذکر کرنے لگے، اس میں میرا مضمون "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری" کئی قسطوں میں مسلسل چھپ رہا تھا، اس کا بھی ذکر کیا، جس سے معلوم ہوا کہ وہ معارف کے مضامین کو بالاستیعاب پڑھتے ہیں، اثنائے گفتگو میں مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا قاری محمد طیب، اور مولانا ابواللیث کی خیریت پوچھی، جس سے اندازہ ہوا کہ ہندوستان کے علمائے کرام سے ان کی پوری واقفیت ہے، ہندوستان کے مشہور شاعر جگن ناتھ آزاد کو بھی پوچھا، میں نے بتایا کہ وہ اس وقت اقبالیات کے بڑے ماہر ہو رہے ہیں، اسی سلسلہ میں جشن اقبال کا ذکر آیا تو میں نے عرض کیا کہ ہماری حکومت کی طرف سے بھی یہ جشن اونچے پیمانہ پر منایا جانے والا ہے، اس کے لیے مختلف کمیٹیاں مقرر ہو گئی ہیں، مولانا کہنے لگے کہ وہ تو چاہتے ہیں کہ ہندوستان و پاکستان کے دانشوروں کی آمد و رفت دونوں ملکوں میں زیادہ سے زیادہ ہوتی رہے، انھوں نے بتایا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی آیندہ عرس کے موقع پر وہ اچھے پاکستانی قوالوں کی ایک بڑی جماعت بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس طرح کی اور گفتگو ہوتی رہی، پھر انھوں نے جناب زاہد ملک صاحب سے کہا کہ اسلام آباد کلب میں میرے لیے ایک افطار پارٹی کی جائے جس میں شہر کے معززین اور ارباب علم مدعو ہوں، اور خود بھی اس میں شرکت کرنے کا وعدہ کیا، جب میں ان سے رخصت ہونے لگا، تو اپنی تمام تصانیف کا تحفہ بندھوا کر عطا کیا، ہوٹل واپس آکر اس کو کھولا، تو اس میں حسب ذیل بڑی چھوٹی کتابیں تھیں: (۱) اسلام ہمارا رہنما ہے، (۲) دین ما اسلام، (۳) بنیادی حقیقتیں، (۴) Fundamentals (۵) خلقت آدم (۶) مطالعۂ تاریخ (۷) آئینۂ تثلیث (۸) عظمت حضرت سیدہؓ، (۹) حضرت داتا گنج بخشؒ (۱۰) حضرت خواجہ معین الدین چشتی، (۱۱) حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، (۱۲) فریضۂ حج (۱۳) اہمیۃ اللغۃ العربیۃ وفضلیتہا

(۱۵) مشروع نشر اللغۃ العربیۃ فی پاکستان، (۱۶) روابط ناگسستنی ایران و پاکستان، (۱۸) اسلامی نظریاتی کونسل (۱۹) قومی تعمیر میں ریڈیو پاکستان کا کردار (۱۹) Pakistan — And Saudi relations (۲۰) عوامی حکومت کی اسلامی خدمت (۲۱) Peoples Government Services to the cause of Islam (۲۲) آزادی صحافت (۲۳) جماعت اسلامی عوامی عدالت میں، (۲۴) ذرگل، (۲۵) نگاہی بہ مناسبت تاریخی و فرہنگی و ادبی میان پاکستان و ایران و آثار و افکار علامہ اقبال لاہوری،

ہوٹل ہی میں خالی اوقات میں ان کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا، سب سے پہلے شوق سے "اسلام ہمارا رہنما ہے" پڑھی، بہت عمدہ چھپی ہے، اس کی روشن چھپائی کی وجہ سے کتاب شروع کر کے ختم کرنے ہی کو جی چاہا، اس میں تحریر کا اسلوب بھی بہت ہی دل نشین ہے، مولانا نے اپنی زندگی ایک اخبار نویس کی حیثیت سے شروع کی تھی، ان کا ہفت روزہ شہاب ان کی ادارت کے زمانہ میں بہت مقبول تھا، اخبار نویس اور صحافت نگار عموماً اچھی علمی و ادبی زبان نہیں لکھ پاتے، مگر مولانا نے صحافت نگاری کی سلاست کا فائدہ اپنی علمی زبان میں پورے طور پر اٹھایا ہے، وہ بڑے اچھے خطیب بھی ہیں، اس لئے اپنی تحریروں میں خطابت کی بھی شان پیدا کر دیتے ہیں، ایجاز کے آرٹ سے بھی اچھی طرح واقف ہیں، پھیلے ہوئے واقعات کو مختصر طریقہ پر سمیٹنا خوب جانتے ہیں۔ اس طرح ایجاز سے بھری ہوئی ان کی تحریروں میں سادگی بھی ملی پرکاری بھی شگفتگی بھی، اور شان خطابت بھی، مثلاً اسلام ہمارا رہنما ہے" کے شروع میں ہے۔

" خدا کے وصف علام الغیوب و الغیوب کی طرح، اسلام بھی آدمی کے سارے عیب

سارے نقص، ساری کوتاہیوں، سارے رازوں اور سارے پوشیدہ امراض حتیٰ کہ رگوں کے موڑوں سے واقف و آشنا ہے، اور اس کے ایک حکیم حاذق کی سی حکمت کے ساتھ آدمی کی کمزوریوں، کوتاہیوں اور بیماریوں کے علاج تجویز فرماتے ہیں "میں یہ بات ایٹمی دھماکوں سے بھری فضا، قمر پیمائیوں، اور سیارہ رسائیوں سے گرم ماحول میں پورے یقین پورے اعتماد اور ایمان محکم کے ساتھ کہہ رہا ہوں اور یہ جانتے اور یہ سمجھتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ انسانی ذہن اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ وہ چاند اور مریخ تک پھیلے کروڑوں میلوں کی مسافت طے کرنے پر قدرت حاصل کر گیا ہے، اس نے فضاؤں، آسمانوں، آفتابوں اور ستاروں کی نبضوں پر اپنے ذہن کی انگلیاں رکھ دی ہیں۔

مگر آدمیت انسانیت کی مزاج شناس، وہ ضمیر بنی آدم کی رگیں اور شریانیں اس کی دسترس میں نہیں آتی ہیں، اس نے آہن و سنگ سے آدمی تو تراش لئے ہیں مگر آدم کے بیٹے کے سینے میں دکھے دل کی دھڑکنوں کو ٹھیک سن نہیں سکا ہے، اس نے ایسے مشینی آلات تو ایجاد کر لئے جو ہزاروں لاکھوں میل کی مسافت سے اٹھنے والی آوازوں کو بروقت قابو میں لے آتے ہیں، مگر آدمی کے اندر کی جو بے چینی اور بے اطمینانی کبھی کبھی اس کی روح کو ان گنت زلزلوں کی زد پہ لے آتی ہے، اس کا راز ابھی تک اس کے ادراک سے باہر ہے، حالانکہ آج سے چودہ سو سال پہلے کے ایک دانائے راز نے ایٹمی توانائیوں سے پرے رہ کر آدمی کی روح کی ہر بے چینی اور ہر اضطراب کی نبض تاپ لی تھی، اور اسلام کی صورت میں اس کا صد درجہ شافی اور صد درجہ کافی علاج تجویز فرمایا تھا۔"

مولانا کی انشا پردازانہ تحریر اس لئے بھی نقل کی گئی ہے کہ ان کے یہاں اسلام کا جو تصور ہے وہ بھی سامنے آجائے، انھوں نے اپنی اس کتاب میں یہ بھی پیامات دیئے ہیں کہ اسلام پوری نوع انسان اور آدمیت کی سربلندی کا پیغام اپنے ساتھ لایا، (ص ۱۱) اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست ہوتی ہے، جس کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ اس کا سربراہ عدل وانصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتا ہو، اور اسے فیصلہ دیتے وقت کوئی لالچ کوئی خوف اور کوئی تعلق حق کا ساتھ دینے سے نہ روک سکے (ص ۱۳) اسلام نے دوسرے مذاہب کو ان کے مذہبی معاملات میں پورے تحفظات عطا کئے ہیں، (ص ۲۰) استحصال جس نوع کا بھی ہو، چوری اس کا باعث ہے غصب اس کا ذریعہ ہو، ذخیرہ اندوزی، چوربازاری یا رشوت کے واسطے سے آدمی کی ہاتھ اس تک پہونچیں، اسلام اسے قطعاً روا نہیں رکھتا، (ص ۳۲) اگر تم موجودہ حال کو بدلنا چاہتے ہو تو اس میں صرف ایک تبدیلی لے آؤ، اسے جھوٹ کے بجائے سچائی کی بنیادوں پر استوار کر دو، تمہارا معاشرہ تھوڑی ہی مدت میں مثالی معاشرہ بن جائے گا (ص ۱۹) مومن اپنے بھائی کا آئینہ ہے (ص ۴۰) مومن وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے اہل ایمان محفوظ رہیں (ص ۵۰) دنیا ہاتھ میں رکھنے کی چیز ہے اسے جیب میں بھی رکھا جا سکتا ہے، لیکن یہ دل میں رکھنے کی چیز نہیں (ص ۶۰) قیامت کے دن آدمی سے جو باز پرس ہوگی، اس میں اس کے مال کے بارے میں پوچھا جائے گا، کہ کہاں سے کمایا، (ص ۶۱) علماء کی عزت لوگوں کے دلوں سے نکل جائے، تو پھر دین کا مقام بھی معاشرے میں نہیں رہے گا، (ص ۶۶) اگر تم اپنے تجارتی معاملات میں خرابیوں کا شکار ہوگئے تو اس کا نتیجہ دنیا و آخرت میں تباہی کے سوا کچھ نہ نکلے گا، (ص ۷۱) سودی مال میں برکت نہیں، (ص ۷۲) دولت ہاتھ میں رکھنی جائز، جیب میں رکھنی جائز، مگر دل میں

رسی جائز نہیں۔ (ص ۷۷) امت مسلمہ کے افراد پر لازم ہے کہ وہ اپنی ہی نہیں بلکہ کل بنی نوع انسان کی فلاح و نجات کے لیے فکر مند رہیں۔ (ص ۸۸) مسلمان حکومت غیر مسلموں کے ساتھ جس رواداری اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرتی رہی ہے، دنیا کی کوئی دوسری حکومت اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی، (ص ۹۴)

یہ پیامات کتنے سچے اور اونچے ہیں، مگر کیا پاکستان میں ان پر عمل ہو رہا ہے؟ مولانا نے جہاں پاکستانیوں کو یہ پیغامات دے کر ان کا درجہ بلند کرنا چاہا ہے، وہاں بڑے دکھ اور درد کے ساتھ یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ

"آج کل ہمارے ہاں یہ شکایت عام ہے کہ لوگوں میں خلوص و محبت اور مہر و وفا کے تعلقات ختم ہوتے جا رہے ہیں، جدھر دیکھو لڑائی جھگڑا ہے، ناراضگیاں اور ناچاقیاں نظر آتی ہیں، بھائی بھائی سے غیر مطمئن ہے، اور ماں باپ اپنی اولاد سے نالاں، دل آپس میں جڑنے کے بجائے کٹتے جا رہے ہیں، حسد، کینہ، بغض اور عداوت کی بیماریاں بڑھتی جا رہی ہیں اور حالت یہاں تک جا پہونچی ہے، کہ اب معاشرے میں ہر شخص اپنی عزت کو غیر محفوظ پاتا ہے"

(ص ۱۸۴)

مولانا نے یہ لکھ کر اس مخلص سرجن کا کام کیا ہے، جو زخم کو اندر دبانے کے بجائے اس کو چیر پھاڑ کر پورے طور پر مندمل کر دیتا ہے، پاکستان کی معاشرت میں جو روگ بقول مولانا پیدا ہو رہا ہے اس کو دور کرنے میں مولانا کی تصانیف مفید ہو سکتی ہیں، وہ ایک عوامی حکومت کے وزیر ہیں، اس لئے ان کی عام فہم اور سلیس تحریروں کے ذریعہ سے اسلامی تعلیمات عوام تک آسانی سے پہونچ سکتی ہیں، خدا کرے ان کی دعوت میں عزیمت بھی ہو، تاکہ جس مقصد سے وہ جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں وہ ہر لحاظ سے کامیاب ہوں،

وفیات

مولانا عبد الباری ندویؒ

از محمد نعیم صدیقی ندوی ایم اے

تلامذۂ شبلی کی بزم دوشیں کا ایک اور چراغ جو مدت سے ٹمٹما رہا تھا گذشتہ دنوں چمنستانِ روزگار کی نوّے بہاریں دیکھ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا، مولینا عبد الباری ندوی نے ۹۰ سال کی عمر میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی، دار العلوم ندوہ نے اپنے دور اوّل میں جتنے نامور اور باکمال فرزند اور علم و دین کے مخلص خادم پیدا کئے ان میں مرحوم کو بہت نمایاں حیثیت حاصل تھی، مبدأ فیاض نے ان میں علم و عمل کی بہت سی خوبیاں جمع کر دی تھیں،

اٹھی ضلع لکھنؤ ان کا آبائی وطن تھا، کچھ اہل خاندان ستر کھ میں بھی آباد ہو گئے تھے، ان کے والد کے بڑے بھائی حکیم امجد علی صاحب اس جوار کے مشہور طبیب تھے، ان کے اثر سے مولانا کے والد حکیم عبد الخالق صاحب گدیہ ضلع بارہ بنکی میں طبیب ریاست مقرر ہو گئے وہیں ۱۸۸۹ء میں مولانا پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مولانا محمد ادریس نگرامی سے حاصل کی، پھر ۱۹۰۲ء میں ندوہ میں داخل ہوئے، علامہ سید سلیمان ندوی اس سے ایک سال قبل ندوہ آچکے تھے جلد ہی دونوں کے درمیان دوستی ہو گئی، بساط شبلی کی حاشیہ نشینی نے اس دوستی میں

اور یکجگی پیدا کی اور زندگی بھر مخلصانہ روابط قائم رہے،

علامہ شبلی کی قدر شناس نگاہ ابتدا ہی میں اس جوہر قابل پر پڑی اور انھوں نے ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی جس پیمان کے وہ خطوط شاہد ہیں جو مرحوم کے نام مکاتیب شبلی کی دوسری جلد میں شامل ہیں، ان میں شفقت و محبت بھی ہے اور علمی مشورے بھی، مرحوم کی ذہنی ترقیات پر اظہار مسرت بھی ہے اور ان سے بلند توقعات کی وابستگی بھی، ندوہ سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک انگریزی زبان اور فلسفہ جدید کی تحصیل میں مصروف رہے، اور ایسی صلاحیت پیدا کی کہ صاحب نظر فلسفی سمجھے جانے لگے، دارالمصنفین قائم ہوا تو کچھ عرصہ یہاں رفیق کی حیثیت سے قیام کیا، پھر دکن کالج پونہ میں عربی و فارسی کے استاد مقرر ہوئے اسکے بعد حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کے شعبہ فلسفہ میں ان کا تقرر ہوا، اور بہت عرصہ تک فلسفہ کا درس دیتے رہے، آخر میں کئی برس شعبہ دینیات کی خدمت بھی خوش اسلوبی سے انجام دی،

مرحوم کی شخصیت قدیم و جدید کا سنگم تھی نئے اور پرانے تعلیم یافتہ دونوں ان کا احترام کرتے تھے، فلسفہ اور علم کلام میں ان کی قابلیت مسلّم تھی، ان فنون کے وہ نکتہ سنج ناقد بھی تھے اور دیدہ ور عالم بھی، مرحوم کا قابل ذکر وصف یہ ہے کہ انھوں نے عام روش کے برخلاف فلسفہ کو الحاد و تشکیک کی تبلیغ کا آلہ کار بنانے کے بجائے اس سے اسلام کے دفاع اور مستشرقین کے رد کا کام لیا، بقول مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، "فلسفہ مولانا عبدالباری کے ہاتھ پر کلمہ پڑھ کر ایمان لے آیا ہے"

وہ ایک مشاق استاد کے ساتھ اردو کے ایک بلند پایہ اہل قلم بھی تھے، انھوں نے ادب و انشاء اور تصنیف و تالیف کا سلیقہ علامہ شبلی سے سیکھا تھا، پھر اپنی فطری ذہانت اور

طباعی سے اس میدان میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے، ایک زمانہ میں "عباری" کے مخفف نام سے ان کے فلسفیانہ مضامین معارف میں شائع ہوتے تھے اور صاحبان علم و ذوق سے داد حاصل کرتے تھے ان کی اس صلاحیت کی بنا پر استاذالاساتذہ علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی کی تیسری جلد میں جو معجزات پر مشتمل ہے، مرحوم سے "معجزات اور فلسفہ جدیدہ" کے موضوع پر ایک باب لکھوا کر شامل کیا، جو نہ صرف جدید علم کلام کا بہترین نمونہ ہے بلکہ زبان و بیان اور طرز استدلال کے اعتبار سے بھی بہت اہمیت کا حامل ہے، دارالمصنفین سے ان کو اس کی تاسیس کے وقت ہی سے بڑا قلبی تعلق تھا، وہ سالہا سال اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن رہے، یہاں سے ان کی کئی کتابیں شائع ہوئیں جن سے اردو کے ذخیرہ میں قابل قدر اضافہ ہوا،

فلسفہ کے ساتھ غیر معمولی شغف کے باوجود ان کے اندر شک و ارتیاب کی کیفیت کبھی نہیں پیدا ہوئی، البتہ منقولات کو اس طرح پیش کرتے تھے کہ عقلیت پسند بھی اس سے مطمئن ہو جائیں، بقول خود "نقل کی کوئی بات عقل کی کسوٹی پر پوری اترے بغیر مان لینا بڑی بے عقلی جانتا تھا"، لیکن آگے چل کر ان کے اندر ایک باطنی انقلاب رونما ہوا، چنانچہ مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت کرلی مرشد سے استفادہ کے علاوہ مولانا تھانوی سے بھی تربیت کا تعلق رکھا، بالآخر راہ سلوک میں اتنا کمال حاصل کیا کہ خلافت کے مستحق قرار پائے، آخر میں روحانیت کا رنگ اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ لکھنؤ میں اپنی کوٹھی کے ایک کمرہ میں گوشہ نشین ہو گئے، اور ہو تو اقبال ان قوتوں کی عملی تفسیر بن گئے، انھوں نے مولانا تھانوی کے افکار و خیالات کو سلسلہ تجدید دین کے نام سے کئی جلدوں میں بڑے سلیقہ کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا ہے، اس سلسلہ کی کتابوں میں جامع المجددین

خصوصیت کے ساتھ لائق مطالعہ ہے،

مرحوم کی تصنیفات کی فہرست مع سنین اشاعت حسب ذیل ہے،

مبادی علم انسانی (۱۹۱۸ء) مذہب عقلیات (۱۹۱۹ء) برکلے (۱۹۱۹ء) علم الاخلاق (۱۹۲۳ء) حدیقہ نفسیات (۱۹۲۸ء) مقدمہ مابعد الطبعیات (۱۹۳۱ء) اخلاقیات (۱۹۳۲ء) طریق اور تفکرات (۱۹۳۲ء) فلسفۂ نتائجیت (۱۹۳۷ء) فہم انسانی (۱۹۳۸ء) علمی نباتیات (۱۹۳۸ء) تجدید تصوف و سلوک (۱۹۴۹ء) جامع المجددین (۱۹۵۰ء) تجدید تعلیم و تبلیغ (۱۹۵۱ء) تجدید معاشیات (۱۹۵۵ء) تفسیر نظام صلاح و فلاح (۱۹۶۴ء) ،

آخر زمانے میں مرحوم نے مذہب و سائنس کے نام سے ایک اہم کتاب لکھی تھی، مشہور ریاضی داں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے اس پر مقدمہ لکھا ہے، جس میں مولانا مرحوم کی بصیرت اور ژرف نگاہی کی داد دی ہے،

مرحوم کی طبیعت میں حق پسندی بے حد تھی، جس بات کو صحیح سمجھ لیتے اس کو بے جھجک کہتے اور بلاخوف لومۃ لائم عمل کرتے، اس راہ میں کسی دوستی اور عزیزداری کی پروا نہ کرتے، راقم الحروف کو اپنی ندوہ کی طالب علمی کے دور میں مرحوم کی خدمت میں بارہا حاضری کی سعادت نصیب ہوئی ہے میرے ساتھ ان کا برتاؤ ہمیشہ شفقت و محبت کا رہا، لیکن اس کے باوجود رفتار و گفتار اور وضع و لباس میں اگر کوئی کوتاہی محسوس کرتے تو سختی کے ساتھ تنبیہ بھی کرتے، گفتگو میں علم کا وقار اور دین کا اخلاص نمایاں ہوتا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو اعلیٰ علیین میں مقام بلند عطا فرمائے،

ادبیات

نعت

از جناب چودھری پربھاون شنکر سحرؔ ووش ایم اے ادی ایڈوکیٹ اناؤ،

قطعہ

واجب کے شاہکار حسین ممکن الوجود
فخر آشنائے خلقت عالم جو ہیں تو آپ

اخلاق بیکراں سے دلوں کو جھکا دیا
نازک مزاج خلق کے محرم جو ہیں تو آپ

بخشا بشر کو عدل و مساوات کا شعور
انسانیت کے محسن اعظم جو ہیں تو آپ

ادنیٰ سا وصف یہ ہے کہ قوسین کی قسم
خالق سے فاصلہ میں کم از کم جو ہیں تو آپ

نظم

ہم سے بھی آج مہر و مودت کا جام لے
اے سرزمین پاک مدینہ سلام لے

اسلام کے مفکر اعظم سلام لے
منصوص حق، مدبر عالم سلام لے

صادق۔ امین، خلق کے رہبر سلام لے
انسانیت نواز، پیمبر سلام لے

ہر دل کو حریت کا طریقہ بتا دیا،
جینے کا ہر بشر کو سلیقہ سکھا دیا

کردار کی ترے جو نمایاں کرن ہوئی
تہذیب ارتقا کی طرف گامزن ہوئی

ہر نقش لوح دل پہ ابھرتا چلا گیا
انسانیت کا حسن نکھرتا چلا گیا

تفریق این و آں کی سیاہی چلی گئی
غنچہ بشر کے پھول کھلاتی چلی گئی

خودداری بشر کی جو محفل بپا ہوئی
ہستی اثر پذیر پرستش انبیاء ہوئی

شانِ خودی کو سُرخیِ ایماں بنا دیا — خود داریٔ حیات کو انساں بنا دیا

پیغامِ حق سے دل کی جو راہیں بدل گئیں — تاریکیاں بھی نور کے سانچے میں ڈھل گئیں

حلقہ بگوش سیرت و کردار ہو گئی — دنیائے فکر مطلعِ انوار ہو گئی

دل کو کلامِ پاک سے سرشاریاں ملیں — سوئے ہوئے ضمیر کو بیداریاں ملیں

آدابِ بندگی کے وہ دیکھے اذان میں — آتی ہو صاف صاف صدا حق کی کان میں

قرآں کی آیتوں نے نگاہیں جھکا اٹھیں — سجدوں میں سر جھکے تو جبینیں دمک اٹھیں

سربستہ رازہائے مساوات کھُل گئے — چھوٹے بڑے سب ایک ترازو پہ تل گئے

شاخِ حیات پر جو محبت کے گُل کھلے — ہاتھوں سے بڑھ کے ہاتھ ملے دل سے دل ملے

دامن میں کوہِ طور کی بجلی لئے ہوئے — حسنِ عمل ہے شمعِ تجلّی لئے ہوئے

ایثار کا جو اہلِ دول کو سبق ملا — نادار کو بھی دہر میں جینے کا حق ملا

مزدور ایک اجر پہ خندق میں پا گیا — جو غیر تھا وہ خویش کے زمرہ میں آ گیا

آواز دی بشر کو بشر کے شعور نے — فرشِ عبائے پاک بچھایا حضور نے

روحِ خجستہ فال کو اپنا بنا لیا — بیگانۂ خیال کو اپنا بنا لیا

انصار کے دلوں میں بسا تھا جو لا شریک — ان میں مہاجرین کو بھی کر لیا شریک

منکر مخالفت کو بڑھے تھے کہ رُک گئے — شانِ سلوک دیکھ کے قدموں پہ جھک گئے

اجسام و روح ہو گئے یوں شیخ و شاب کے — خوشبو تھی ایک رنگ تھے بدلے گلاب کے

اس تیرہ دلبراں میں حدیثِ دگر بھی ہو — اہلِ خرد کو دعوتِ فکر و نظر بھی ہے

دیکھا سروش نے کہ حق آگاہ ہو گئی
بجلی چمک کے شمعِ سرِ راہ ہو گئی

مطبوعاتِ جدیدہ

رسالۃ التوحید (عربی) ترجمہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، تقطیع خورد، کاغذ بہتر، خوبصورت ٹائپ صفحات ۱۲۰، قیمت درج نہیں، پتہ:- مکتبہ یحیویہ سہارنپور

ردِ شرک و بدعت میں مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان نہایت مشہور و مقبول کتاب ہے، اس کے متعدد اڈیشن چھپے اور مسلمانانِ ہند کو اس سے بڑا فائدہ پہنچا، اب شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کی خواہش پر مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے اس کو اردو سے عربی میں منتقل کیا ہے اور شیخ ہی کے ایما سے ترجمہ کا آغاز مسجد نبوی میں کیا، اصل کتاب تبصرہ و تعارف سے مستغنی ہے، اور ترجمہ کی خوبی اور شگفتگی کے لئے فاضل مترجم کا نام کافی ہے، انھوں نے متعدد ذیلی عنوانات کا اضافہ کر دیا ہے، اور حواشی میں عرب قارئین کی سہولت کے لئے ان مخصوص ہندوستانی رسموں اور اشخاص وغیرہ کی وضاحت بھی کر دی ہے، جن کا ذکر کتاب میں آیا ہے، نیز آیتوں کے حوالے اور مصنف کے خیالات کی تائید میں دوسرے علمائے اسلام کے بیانات بھی نقل کر دیئے ہیں، شروع میں اپنے پدرِ بزرگوار مولانا سید عبد الحئی صاحب حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء کی مشہور تصنیف نزہۃ الخواطر سے مصنف کے حالات و کمالات اور خود تقویۃ الایمان کی خصوصیات و مندرجات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے، چند سال پہلے اس کتاب کا جامعہ سلفیہ بنارس کے ایک استاد نے بھی عربی میں ترجمہ کیا تھا، غالباً وہ فاضل مترجم کی نظر سے نہیں گزرا

دیوان زادہ (حاتم) مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب، تقطیع کلاں

کاغذ بہتر، طباعت ٹائپ مجموعی صفحات ۳۰۰ مجلد مع گرد پوش قیمت ۱۵ روپیہ، پتہ:

مکتبہ خیابان ادب ۳۹ چیمبرلین روڈ۔ لاہور،

شیخ ظہور الدین حاتم اردو کے قدیم اساتذۂ سخن اور برگزیدہ شعراء میں تھے،
انھوں نے اپنے قدیم ضخیم دیوان کا خود "دیوان زادہ" کے نام سے انتخاب کر کے متعدد اشعار
اور غزلیں نکال دی تھیں اور زبان و بیان میں بھی بہت کچھ رد و بدل کر دیا تھا لیکن
ان دونوں (قدیم دیوان اور اس کے انتخاب) کی اشاعت کی ابھی تک نوبت نہ آئی
تھی، ۱۹۲۵ء میں کانپور سے مولانا حسرت موہانی مرحوم نے کلام حاتم کا جو انتخاب
شائع کیا تھا وہ مختصر اور نامکمل تھا، اب نصف صدی کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور
کے پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی توجہ و محنت کے نتیجہ میں حاتم کا انتخاب کردہ
دیوان زادہ شائع ہوا ہے جو فاضل مرتب کے حواشی و تعلیقات اور فاضلانہ مقدمہ
سے بھی مزین ہے، مقدمہ میں بڑی کد و کاوش سے حاتم کے حالات اور ادبی و لسانی
خدمات کا مرقع اور اردو کلام پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے، اس میں حاتم کی اردو فارسی
نثر نگاری، فارسی شاعری، فن سپہ گری میں کمال کے علاوہ اس زمانہ کے سیاسی مد و جزر
کا ذکر بھی آگیا ہے، دیوان زادہ غزلیات کے علاوہ دوسرے اصناف کلام پر بھی مشتمل
ہے اور اس میں حاتم کے دور کے سیاسی، تمدنی اور معاشرتی حالات کی جھلک بھی ہے،
ڈاکٹر غلام حسین نے اس دیوان کو مصنف کی زندگی کے آخری دور کے لکھے ہوئے ایک
قلمی نسخہ سے جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کی ملکیت ہے، مرتب کیا ہے، اور لندن
رامپور اور کراچی کے قلمی اور مولانا حسرت موہانی کے مطبوعہ نسخوں سے بھی

مدد لی ہے، اصل اور امدادی نسخوں کے معمولی فرق کو حاشیے میں اور بڑے فرق کو تعلیقات کے ضمیمہ
کے اندر ظاہر کیا گیا ہے، پہلے ضمیمہ میں وہ اشعار درج ہیں جو دوسرے نسخوں میں اس نسخہ سے مختلف
نقل ہوئے ہیں، اور دوسرے میں ان زائد اشعار کو نقل کیا گیا ہے، جو لاہور کے نسخوں میں درج
نہیں ہیں، اور دوسرے نسخوں میں درج ہیں، اصل دیوان حروف تہجی میں مرتب کیا گیا تھا"
لیکن ڈاکٹر صاحب نے ترمیم کر کے غزلوں کو سنہ وار مرتب کیا ہے، اور قوسین میں ان پر نمبر
بھی ڈال دیے ہیں، آخر میں فہرست اور مشکل الفاظ کا فرہنگ، اور شروع میں لاہور کے قلمی
نسخہ کے ایک ورق کا عکسی فوٹو بھی دیا گیا ہے، اس ادبی و تحقیقی خدمت پر فاضل مرتب تبریک
تحسین کے مستحق ہیں،

قرآنی ضرب الامثال: مرتبہ جناب حکیم انیس احمد صاحب خیرآبادی تقطیع خورد،
کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۲۶، قیمت ۲ روپے، پتہ: حکیم انیس احمد خیرآبادی
دواخانہ سلطانیہ عثمان پورہ حیدرآباد نمبر ۲۴، آندھرا پردیش،
اس میں مولوی حکیم انیس احمد خیرآبادی نے مسلمانوں کی روزمرہ گفتگو اور تقریر و تحریر میں
استعمال کے لئے قرآن کی منتخب آیتیں اور ٹکڑے جمع کئے ہیں، گو سب منتخب ٹکڑوں کو ضرب المثل نہیں
کہا جا سکتا، تاہم ان کو بول چال میں بے تکلف استعمال کیا جا سکتا ہے، اللہ
تبارک و تعالیٰ مرتب کو اس قرآنی خدمت کا صلہ اور مسلمانوں کو قرآن مجید سے استفادہ
کی توفیق عطا فرمائے،

علمی ادبی اور تعلیمی ادارے: مرتبہ جناب ابو سلمان شاہجہان پوری و امیر الاسلام
صاحبان، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر صفحات ۳۶۰، قیمت
درج نہیں، پتہ: گورنمنٹ کالج کراچی،

مطبوعات جدیدہ

یہ گورنمنٹ کالج کراچی کے مجلہ علم و آگہی کا خاص نمبر ہے، اس میں گذشتہ دو سو سال کے ہند و پاک کے اہم اداروں کے متعلق سات حصوں میں ۳۵ مضامین شامل کئے گئے ہیں پہلے حصہ میں جدید و قدیم تعلیم گاہوں اور دوسرے میں علمی و تعلیمی اور تیسرے میں تحقیقی و تصنیفی اداروں کا ذکر ہے، ایک حصہ اردو کی اشاعت و ترقی کے لئے قائم ہونے والے اداروں کے لئے مخصوص ہے، آخر میں ادبی قومی اور تاریخی نوعیت کے اداروں کا ذکر ہے، شروع کے تمہیدی مضامین میں علم کی دینی اہمیت مسلمانوں کے علمی انہماک اور مختلف النوع اداروں کی ضرورت و خدمات کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے، مدرسہ عالیہ کلکتہ، فورٹ ولیم کالج کلکتہ، دہلی کالج، دار العلوم دیوبند، مدرسۃ العلوم علی گڈھ، اورنٹیل کالج لاہور، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، اسلامیہ کالج پشاور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، جامعہ ملیہ دہلی، آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ، انجمن حمایت اسلام لاہور، آل پاکستان ایجوکیشنل کراچی، انجمن اسلام بمبئی، سائنٹفک سوسائٹی علی گڈھ، دار المصنفین اعظم گڈھ، ندوۃ المصنفین دہلی، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد، دائرۃ المعارف الاسلامیہ لاہور، انجمن ترقی اردو، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد، مجلس ترقی ادب لاہور، مرکزی اردو بورڈ لاہور، ترقی اردو بورڈ کراچی، انجمن ترقی پسند مصنفین، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی جیسے ممتاز اداروں کے اغراض و مقاصد خصوصیات و خدمات اور ان سے وابستہ بعض اشخاص کا ذکر ہے، ابھی تک اتنے سارے اداروں کا کسی کتاب یا نمبر میں یکجا تذکرہ موجود نہیں تھا، اس حیثیت سے یہ نمبر مفید ہے، جو متعدد عظیم اداروں کے متعلق معلومات پر مشتمل ہے، مگر بعض مضامین ہلکے ہیں، اور ان میں غلطیاں بھی رہ گئی ہیں، کہیں کہیں جذبات و تعلقات کا اثر بھی محسوس ہوتا ہے، اگر ہر ادارہ کے متعلق اس سے وابستہ افراد کے مضامین شامل کئے جاتے تو یہ نمبر زیادہ جامع، اہم اور قابل اعتماد ہو جاتا، جن اداروں کا اس نمبر میں تذکرہ نہیں ہے، آیندہ خاص نمبر میں ان کا ذکر ہوگا،

چراغ رہ گذر:۔ مرتبہ جناب خواجہ احمد صاحب فاروقی تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت طباعت عمدہ، صفحات ۲۸۶ مجلد، قیمت ۵ روپیہ، پتہ:۔ گلستان پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶۔

زیر نظر کتاب پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب کے بارہ ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے، یہ سب مضامین غالباً پہلے بھی چھپ چکے ہیں، ان میں بعض ان قلمی کتابوں کے جن کو خواجہ صاحب نے ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے، مقدمے ہیں اور بعض مستقل رسالوں کی صورت میں علحدہ طبع ہو چکے ہیں جیسے "اردو میں وہابی ادب" اس پر معارف میں ریویو کیا جا چکا ہے، دو مضامین غالبیات سے متعلق ہیں آخر میں تین مضامین کے اندر اردو کے موجودہ بعض اہم مسائل نصاب، رسم خط اور اردو یونیورسٹی کی تجویز پر اظہار خیال کیا گیا ہے، یہ خاص طور پر اردو کے حامیوں کے لئے قابل توجہ ہیں، ان میں اردو نصاب کی اصلاح و توسیع اور اس کی یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت واضح کی گئی ہے، نیز اس کے رسم خط کے متعلق شکوک و اعتراضات کا مدلل جواب دیا گیا ہے ضمناً اردو کی مقبولیت و ہمہ گیری، تعلیم کا مقصد، مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کا بھی ذکر آگیا ہے، اکثر مضامین غور و فکر کا نتیجہ ہیں، لیکن بعض ہلکے پھلکے بھی ہیں، تاہم خواجہ صاحب کی جادو نگاری اور رعنائی تحریر نے سب میں بڑی کیفیت و تازگی پیدا کر دی ہے،

مقالات شریعت و حکمت: از مولانا حکیم محمد زماں صاحب حسینی قاسمی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۰۰، مجلد مع گرد پوش قیمت ۱۲۰ پیسے، پتہ:۔ محمد عرفان علوی

منیجر قاسمی دواخانہ نمبر ۸ کرڈ ٹولہ اسٹریٹ کلکتہ،

مولانا حکیم محمد زماں صاحب کلکتہ کے حاذق طبیب اور ایک صاحب علم و عمل شخص ہیں ان کے سرچشمہ علم و حکمت سے روحانی و جسمانی دونوں طرح کے مریض فیضیاب ہوتے ہیں، یہ رسالہ اُن کے چند اصلاحی دینی و طبی مضامین کا مجموعہ ہے اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اوصاف و شمائل اور اسلامی تعلیمات کو پیش کرکے مسلمانوں کو اتباع سنت و اجتناب بدعت کی تلقین کی گئی ہے، اس کے ساتھ طب و حکمت کی مفید اور کارآمد باتیں بھی تحریر کی گئی ہیں، اس طرح یہ رسالہ اسم بامسمّیٰ اور اس کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق ہے۔" ض"

(فارم ۱۷)

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	سید اقبال احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	"
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
اڈیٹر	سید صباح الدین عبد الرحمٰن
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	"

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ سید اقبال احمد

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی و تحقیقی و ادبی و تنقیدی و تاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے علاوہ جو مطالعہ و بصیرت تجربہ و مشاہدہ اور فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات و تراجم کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے،

۱۔ مہاجرین جلد دوم قیمت: ۹-۱۲

۲۔ سیر الصحابہ جلد ۶ " ۴-۹

امام حسین کے حالات زندگی کے ضمن میں واقعہ محزنہ کربلا کی غم انگیز تفصیل،

۳۔ سیر الصحابہ جلد ۷

۴۔ تابعین: ۹۶ اکابر تابعین کے سوانح،

قیمت: ۵۰-۱۲

۵۔ تاریخ اسلام اوّل (عہد رسالت و خلافت راشدہ)

قیمت: ۵۰-۱۲

۶۔ تاریخ اسلام دوم (خلافت بنی امیہ) ۰۰-۱۱

۷۔ تاریخ اسلام سوم (خلافت عباسیہ اوّل)

قیمت: ۰-۱۴

۸۔ تاریخ اسلام چہارم (خلافت عباسیہ دوم)

قیمت: ۰-۱۵

۹۔ اسلام اور عربی تمدن قیمت: ۶۵-۱۵

۱۰۔ عرب کی موجودہ حکومتیں،

قیمت

۱۱۔ ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲۔ دین رحمت قیمت ۰۰-۱۰

۱۳۔ خریطۂ جواہر ۷۵-۴

زندگی کی آخری کتاب

۱۴۔ حیات سلیمان: یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا دلآویز مرقع، اور اپنے اسلوب و طرز انشا، اور تحقیق کے لحاظ سے حیات شبلی کا ثانی، دلکش، دلچسپ اور پُر معلومات اسی سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے، قیمت: ۵۰-۲۷